عراق

کل اور آج

مصنف

شکیل حسن شمسی

نام کتاب: عراق کل اور آج

مصنف: شکیل حسن شمسی

۷/۳، جوہری محلہ چوک لکھنؤ، 226003

ناشر: نور ہدایت فاؤنڈیشن

امام باڑہ غفرانمآب، مولانا کلب حسین روڈ چوک، لکھنؤ

سن اشاعت: دسمبر 2010

ایڈیشن: اوّل

قیمت: 100 روپئے

ملنے کا پتہ:

(۱) ۷/۳، جوہری محلہ چوک لکھنؤ، 226003

(۲) نور ہدایت فاؤنڈیشن، امامباڑہ غفران مآب، چوک، لکھنؤ-۳

انتساب

ان محبان حسین کے نام

جن کے ہاتھ پیر کاٹے گئے

لیکن پھر بھی دنیا انھیں قبر حسینؑ

کی زیارت سے روک نہیں سکی

فہرست مضامین

پیش لفظ

کبھی کبھی آپ سب کچھ اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں لیکن آنکھوں پر یقین نہیں آتا میرے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوا جب میں نے پہلی بار عراق کی سرزمین پر قدم رکھا۔ ہوا یوں کہ میرے ایک قریبی دوست محترم آغا سلطان نے گزشتہ سال صفر کے مہینے میں بنگلور کی اپنی سالانہ مجلس کے دوران مجھ سے کہا کہ اس بار شعبان میں تیار رہئے گا آپ کو کربلا جانا ہے۔ مجھے لگا کہ یہ بس یہ ایک رسمی سا جملہ ہے اور ایک دوست کی جانب سے اظہار محبت کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے میں نے مزید استفسار نہیں کیا۔

آغا سلطان سے میری دوستی آٹھ نو سال پرانی ہے۔ انھوں نے مجھے پہلی بار 2003 میں بنگلور کے اس پروگرام میں بلایا تھا جو وہ ہر سال صفر کے دوسرے اتوار کو رچمنڈ ٹاؤن کے شیعہ قبرستان میں منعقد کرتے ہیں۔ وہاں صبح کو مجلس ہوتی ہے اور شام کو یوم حسین کا انعقاد ہوتا ہے۔ یہ دونوں پروگرام بنگلور کے سب سے بڑے پروگرام تصور کئے جاتے ہیں۔ آغا سلطان خود ایک مشہور سماجی و سیاسی کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر تعلیم اور کامیاب بزنس مین بھی ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں ہماری اور ان کی گہری دوستی ہوگئی۔ میں ہر سال بنگلور جانے لگا بلکہ سال میں دو بار وہاں جانا لازمی سا ہو گیا تھا۔ آغا سلطان کی وجہ سے بنگلور کے مومنین سے ایک گہرا جذباتی اور ایمانی رشتہ قائم ہو گیا۔ خیر۔۔۔ پھر ایک دن آغا سلطان کا فون آیا کہ میں اپنا بائیوڈاٹا ان کو انگریزی اور عربی میں ای میل کے زریعہ بھیج دوں تو مجھے لگا کہ اب عراق کا سفر شائد ایک حقیقت بننے والا ہے۔ میں نے اپنے بائیوڈاٹا کا ترجمہ عربی میں کروایا۔ اور آغا سلطان کو روانہ کر دیا۔ اس کے بعد میں نے کچھ نہیں پوچھا لیکن اچانک 29 جون 2010 کو میرے ای میل پر ایک ایسا دعوت نامہ آیا جس کو دیکھ کر حیرت سے میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

یہ ای میل کربلا میں امام حسین کے روضے کا انتظام دیکھنے والی کمیٹی (ادراۃ العتبۃ الحسینیۃ المقدسۃ) کے ایک اہم ذمہ دار جناب سید سعد الدین ہاشم کی جانب سے بھیجا گیا تھا۔اس دعوت نامہ کی عبارت اس طرح تھی" ہندوستان کے کثیر الاشاعت اردو اخبار روزنامہ راشٹریہ سہارا کے صحافی شکیل حسن شمسی صاحب۔السلام علیکم۔ابی الاحرار(دنیا کے تمام آزاد لوگوں کے آقا)اور سید الشہدا (شہیدوں کے سرادر) حضرت امام حسین کے روضے کے اطراف سے ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ آپ اپنی رحمتوں کے سائے اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔امام حسین علیہ السلام کے روضے کا انتظام دیکھنے والی کمیٹی کی خواہش کے آپ جشن ربیع الشہادہ (بہار شہادت کے جشن) کے عنوان سے منعقد ہونے والے چھٹے انٹرنیشنل فیسٹول میں شریک ہوں۔یہ جشن حضرت امام حسین اور حضرت عباس کے روضوں کی دیکھ بھال کرنے والی کمیٹی کی جانب سے تین شعبان سے آٹھ شعبان (16 جولائی سے 21 جولائی 2010) تک کربلا کے مقدس شہر میں منعقد ہوگا۔برائے کرم اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کو یہاں اس جشن سے کم از کم تین روز قبل پہنچنا ہے۔ہم آپ کے سفر اور یہاں کی آمد کے خوشگوار اور بخیر ہونے کی دعا کرتے ہیں۔نیک خواہشات کے ساتھ۔

خادم امام حسین علیہ السلام۔

سید سعد الدین ہاشم۔ڈائریکٹر آف جنرل سکریٹری

یہ دعوت نامہ 29 جون کو ہی جاری کیا گیا تھا۔برادر محترم مولانا کلب جواد صاحب اور میرے عزیز دوست پروفیسر عین الحسن کو بھی اس جشن میں مدعو کیا گیا تھا ان حضرات کا دعوت نامہ بھی میرے ہی ای میل پر بھیجا گیا تھا۔میں اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔خط دیکھتے ہی خوشی سے جھوم اٹھا۔اپنے تمام ساتھیوں کو بتایا سب نے مبارک باد دی۔اس کے بعد میں نے فوراً اپنی ماں کو لکھنؤ میں فون کیا اور ان کو خبر دی۔(میری والدہ کربلا میں پیدا ہوئی تھیں اور گھر کے

لوگ ان کو محبت سے کربلائی بیگم بھی کہا کرتے تھے) میری والدہ بھی بہت خوش ہوئیں۔اس دعوت نامہ کے بعد مجھے اب سوائے کربلا اور نجف کے نہ تو کچھ سنائی دے رہا تھا نہ ہی کچھ دکھائی دے رہا تھا۔میں نے فوراً اپنے کرم فرما،دوست اور بھائی عزیز زیدی کے صاحبزادے ناصر زیدی کو فون کیا جو اپنے والد کی ٹریول ایجنسی Pacific Travel کا انتظام بہت حسن و خوبی اور ایمانداری سے نبھا رہے ہیں۔ان کو بتایا کہ مولانا کلب جواد صاحب،پروفیسر عین الحسن اور مجھ کو نجف جانا ہے تو انھوں نے کہا کہ وہ گلف ائیر لائین سے رسمی طور پر ٹکٹ بک کروائے دیتے ہیں اور ویزہ آنے کے بعد وہ باقاعدہ طور پر ٹکٹ جاری کریں گے۔ہمارے ٹکٹ دہلی سے مناما(بحرین) کے راستے نجف تک عارضی طور پر بک ہو گئے۔

خود آغا سلطان اپنے والد جناب مرزا عباس بیگ اور میسور کے معروف سرجن ڈاکٹر رضا کے ہمراہ چنئی سے اس سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔اب صرف ویزے کا انتظار تھا۔ہندوستان سے عراق جانے کے لئے انفرادی طور پر ویزہ ملنے میں کافی دقتیں ہیں لیکن اگر قافلے کے شکل میں وہاں لوگ جائیں تو ویزہ ملنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ہم لوگ کسی قافلے میں تو جا نہیں رہے تھے اس لئے ہمارے ویزے عراق کی وزارت خارجہ سے ہی آنا تھے۔ایک ہفتہ کے انتظار کے بعد عراق کی وزارت خارجہ کی جانب سے ہمارے ویزے آگئے۔اب راستے میں کوئی اڑچن نہیں تھی اس لئے باقاعدہ طور پر ٹکٹ بک کر دئے گئے لیکن اچانک برادر محترم مولانا کلب جواد صاحب کو اس وقت ہلکا سا قلبی دورہ پڑا جب وہ لکھنؤ سے دہلی کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ان کو ڈاکٹروں نے سفر کے لئے منع کر دیا ان کا ٹکٹ واپس کرنا پڑا۔بے انتہا مصروفیت کے باوجود میں نے جشن ربیع الشہادہ میں پیش کرنے کے لئے ایک مقالہ انگریزی میں تیار کیا اور اس کا عربی ترجمہ اپنے دوست جناب جسیم صاحب سے کروایا۔اس مقالے کی ایڈیٹنگ میرے برادر نسبتی عرفان علی میرزا نے بہت دل لگا کر کی۔

آخر وہ دن آ گیا جب میں سب سے یہ کہنے لگا کہ کل میں کربلا جا رہا ہوں۔ ناصر زیدی صاحب نے ٹکٹ، پاسپورٹ اور ویزے کا انگریزی ترجمہ (منظور شدہ مترجم سے کروا کر) میرے گھر پر ہی بھیج دیا۔ میں دن بھر آفس میں مصروف رہا شام کو گھر لوٹ کا سامان باندھا۔ میری فلائٹ 16 جولائی کی صبح 07.30 پر تھی اور مجھے ساڑھے چار بجے صبح کو ائیر پورٹ پر پہنچنا تھا، اس لئے کچھ وقت تھا میرے پاس آرام کرنے کا لیکن آج کی رات نیند کہاں اور میں کہاں؟ ساری رات میں نے گھر کی بالکنی میں بیٹھ کر کاٹ دی جہاں سے مسلسل ہوائی جہاز آتے جاتے دکھائی پڑتے ہیں۔ مجھ کو لگتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں سو جاؤں اور الارم کی آواز مجھے سنائی نہ پڑے اور میں سوتا ہی نہ رہ جاؤں۔ کسی طرح رات آنکھوں میں کاٹ کر صبح کی اور چار بجے ائیر پورٹ کے لئے روانہ ہو گیا۔

ائیر پورٹ پر کوئی پریشانی نہیں ہوئی امیگریشن میں جو افسر بیٹھے تھے انھوں نے میرا نام پاسپورٹ پر دیکھتے ہی کہا آپ لکھنؤ کے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا تعلق بھی لکھنؤ سے ہے اور جس زمانے میں میرا نام دوردرشن کے لکھنؤ کیندر سے خبرنامے کے بعد نشر ہوا کرتا تھا۔ تب سے وہ میرے نام سے واقف ہیں انھوں نے بڑی خوش اخلاقی سے امگریشن کی مہر لگائی اور اس طرح اب جہاز پر بیٹھنے کے سوا کچھ باقی نہیں رہ گیا۔

صبح ساڑھے سات بجے گلف ائیر لائین کی فلائٹ مناما (بحرین) کے لئے روانہ ہوئی۔ بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ ہندوستان کے زائرین اب دہلی سے بحرین ہو کر اطمینان سے نجف پہنچ سکتے ہیں پہلے تمام زائرین کو شام یا ایران کے راستے سے کربلا جانا پڑتا تھا۔ 2008 میں نجف کا ہوائی اڈہ کھل جانے کے بعد آس پاس کے کئی ممالک نے نجف کے لئے پروازیں شروع کر دیں اور اب ہم ہندوستانی براہ راست تو نہ سہی لیکن شارجہ، دبئی یا بحرین سے فلائٹ تبدیل کر کے بہت آسانی سے نجف پہنچ سکتے ہیں۔

میں نے ہندوستان سے عراق کی جانب روانگی سے قبل ہی ذہنی طور پر یہ بات طئے کر لی تھی کہ وہاں سے لوٹ کر سفر نامہ ضرور لکھوں گا لیکن یہ سفر نامہ صرف ایک سفر کی روداد نہیں ہوگی بلکہ کوشش یہ کروں گا کہ کچھ ایسی باتیں عوام تک پہنچاؤں جن سے اب تک بہت سے لوگ ناواقف ہیں۔ اسی لئے میں نے پہلے دن سے یہی کوشش کی کہ نجف، کربلا، کوفہ، بغداد اور سامرہ کی تاریخی حیثیت سے بھی لوگوں کو آگاہ کرواؤں اور ایسے حوالوں کو بھی تلاش کروں جن سے اہل ہند کے سرزمین عراق سے گہرے لگاؤ کا بھی لوگوں کو اندازہ ہو سکے۔

میں نے اس کتاب میں ایک کوشش یہ بھی کی ہے کہ عراق میں مدفون اماموں کے روضوں کی تاریخ بھی آپ لوگوں تک پہنچا سکوں۔ شائد اردو میں یہ کوشش پہلی بار کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں کربلا میں مقدس روضوں کی دیکھ بھال کرنے والی کمیٹی کی میڈیا سیل سے بھی مجھے تفصیلات ملیں مدد کی اور انٹرنٹ پر موجود اطلاعات نے بھی میری کافی مدد کی۔ میں نے اپنی بات کا آغاز کرنے کے لئے عراق کی مختصر تاریخ کو منتخب کیا تا کہ قارئین جان سکیں کہ یہ ملک کب مسلمانوں کے قبضے میں آیا اور یہاں چھ اماموں کی قبریں کیوں بنیں؟ میں نے حتیٰ الامکان کوشش کی ہے کہ میں آپ تک اس کی تفصیل بھی پہنچا دوں کہ عراق پر حکومت کرنے والوں میں کون سا حاکم ایسا تھا جس نے اماموں کے روضوں کی تعمیر و توسیع میں حصہ لیا اور کون کون سے ایسے ظالم یہاں اقتدار پانے میں کامیاب ہوئے جنھوں نے آل رسول کو روضوں کو تاراج کیا۔ اگر آپ کو اس کتاب میں کچھ نئی باتیں ملیں اور آپ کا دل خوش ہو تو برائے کرم ایک سورۂ فاتحہ میرے والد جناب شمس الحسن تاج ابن مولانا اولاد حسین کے نام پڑھ کر بخش دیں۔ جنھوں نے اپنی اولادوں کے دلوں میں اسلام اور اہلبیت رسول سے محبت کوٹ کوٹ کر بھری۔ والسلام

شکیل حسن شمسی

shakeelhshamsi@gmail.com

عراق کی مختصر تاریخ

عراق دنیا کے ان ممالک میں سے ایک ہے جو ہزاروں برس پرانی تہذیب، ثقافت اور تمدن کے لئے دنیا میں پہچانے جاتے ہے۔عراق میں Mesopotamia تہذیب کے وجود کا تذکرہ تاریخی حوالوں میں موجود ہے۔ بلاد ما بین النہرین کے نام سے مشہور یہ تہذیبی دور دس ہزار برس قبل مسیح وہاں کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ وہاں چھ ہزار سال قبل مسیح Sumer سمیر تہذیب کا بول بالا تھا اور یہ تہذیب تقریباً 3000 ہزار سال تک قائم رہی۔اس کے بعد Babylon یعنی بابل کا تہذیبی دور عراق میں آیا جس کے نشانات آج بھی باقی ہیں۔

ایک ہزار سال قبل مسیح یہاں Neo-Assyrian Empire کا قیام ہوا اور اس دور کی تہذیب نے عراق پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ۔اس کے بعد کچھ عرصہ تک یہاں Neo-Babylonian Empire قائم رہا۔539 قبل مسیح اس سرزمین پر یران کے شہنشاہ سائرس دی گریٹ نے راج کیا اور پارسی تہذیب کے نقوش چھوڑے۔ پھر 331 سال قبل مسیح روم کے شہنشاہ سکندر اعظم نے اس سرزمین پر قبضہ کر لیا لیکن تیسری صدی قبل مسیح عراق Parthian Empire کے زیر اقتدار آ گیا۔اس شہنشاہی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب دوسری صدی عیسوی میں رومی افواج نے شہنشاہ Trajan کی قیادت میں اس زمین کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ روم والوں کا یہ اقتدار تیسری صدی عیسوی میں اس وقت ختم ہوا جب ایران کے ساسانی سلسلے کے طاقت ور شہنشاہ اردشیر نے عراق پر قبضہ کر لیا۔

چھٹی صدی عیسوی میں پیغمبر حضرت محمدؐ اس دنیا میں نور اسلام لے کر آئے اور اس کی روشنی رفتہ رفتہ ساری دنیا میں بھی پھیلنے لگی۔رسول نے مکہ میں اسلام کی تبلیغ کا کام شروع کیا تھا لیکن ان کو وہاں تکلیفوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا پھر بھی اسلام کی تبلیغ کا کام وہ اپنے چچا حضرت ابو

طالب کے سائے میں رہ کر کرتے رہے جو اس وقت اہل مکہ کے سردار اور کعبہ کے محافظ تھے۔
حضرت ابو طالب کے انتقال کے بعد حضرت محمد کا مکہ میں رہنا ناممکن ہو گیا اور ان کو قتل کئے جانے کی سازشیں بہت گہری ہو گئیں تو ان کو عین اس رات میں اپنا گھر چھوڑ کر مکہ کے لئے روانہ ہونا پڑا جب عرب کا سازشی ٹولہ ان کو قتل کرنے ہی والا تھا لیکن وہ اپنے بستر پر حضرت علی کو سوتا چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ان کے دشمن یہی سمجھتے رہے کہ گھر میں حضرت محمد سو رہے ہیں لیکن جب انھوں نے چادر ہٹائی تو دیکھا کہ حضرت علی خوابیدہ ہیں۔

حضرت محمد خیریت سے مدینہ پہنچ گئے اور پھر اللہ نے ان کو اس وقت کے سب سے زیادہ طاقت ور طبقہ کی یورشوں سے بچایا اور مختلف جنگوں میں کامیابی سے اس طرح ہمکنار کیا کہ وہ ایک بڑی اسلامی سلطنت کے سربراہ بن گئے لیکن انھوں نے نہ تو بادشاہی اختیار کی، نہ دربار عام اور دربار خاص قائم کئے اور نہ اپنے لئے محل تعمیر کروایا بلکہ مسجد نبوی کے منبر پر بیٹھ کر انسانوں کی فلاح و بہبود کا کام انجام دیا۔ان کے پیغام کی روشنی ہر طرف پھیلنے لگی؟ غیر عرب لوگوں میں (سب سے پہلے)مشرف بہ اسلام ہونے والوں میں ایک ایرانی سرمایہ دار کا وہ بیٹا تھا جس کو بردہ فروشوں نے اغوا کر کے غلام بنا لیا تھا۔ان کا نام ماں باپ نے 'روز بہہ' رکھا تھا لیکن دنیا آج ان کو حضرت سلمان فارسی کے نام سے جانتی ہے۔ن کے بعد عراق اور ایران کے بہت سے لوگ اسلام قبول کرنے کے لئے بیتاب ہونے لگے۔اس کے لئے نہ تو پیغمبر کو لشکر کشی کرنا پڑی نہ ہی انھوں نے جنگ کا سہارا لیا۔حضرت محمد نے اپنا پیغام صرف روحانی طاقت اور قران کی تعلیمات کی قوت پر اسلام کو اہل عراق و ایران کے دلوں میں اتار دیا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایران اور عراق میں اسلام قبول کرنے والوں کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا خاص طور پر سرحدی علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کو بہت اذیتیں اٹھانا پڑیں جس کی وجہ سے کئی بار مسلمانوں اور ساسانی حکومت میں ٹکراؤ ہوا۔

پیغمبر حضرت محمد کی وفات کے بعد مسلمانوں اور پارسیوں کے درمیان کشمکش مزید بڑھ گئی۔
ایران کا عظیم شہنشاہ یزدگرد (سوئم) مسلمانوں کے لئے مصیبت بن گیا تھا۔سرحدی علاقوں
میں بسنے والے مسلمانوں کو پریشان کرنا۔ان پر ظلم وستم کرنا اور اذیتیں پہنچانا یزدگرد کی حکومت
کا شیوہ بن چکا تھا۔ان علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کو بچانے کے لئے مسلمانوں ور پارسی
افواج کے درمیان کئی بار معرکہ آرائی ہوئی لیکن مسلمانوں کو پہلی کامیابی 633 میں جنگ والاجہ
میں اور دوسری بڑی کامیابی 636 میں جنگ قادسیہ میں ملی اور مسلمانوں کے اقتدار کا دروازہ
کھل گیا اور عراق کے ساتھ ساتھ ایران کے کئی علاقوں پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ان
جنگوں میں ایک بہت بڑے خطہ پر قبضہ کر لینے کے باوجود یزدگرد کی سلطنت کا خاتمہ نہیں ہو
سکا اور یزیدگرد نے اسلامی مملکت کے خلاف اپنی جدوجہد مختلف شکلوں میں جاری رکھی آخر کار
642 میں مسلمانوں نے یزدگرد کو جنگ نہاوند میں زبردست شکست دی مگر اس جنگ میں بھی
یزدگرد بچ گیا اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ یزدگرد 651 میں ایران کے مرونامی مقام
پر مارا گیا اور اس کا لڑکا فیروز پامیر کے پہاڑی علاقوں (موجودہ تاجکستان) کی طرف فرار ہو
گیا جہاں سے بعد میں وہ تنگ چین کے علاقہ میں آباد ہوا۔ یزدگرد کے خاندان کے کچھ لوگ
گرفتار ہوئے ان میں اس کی ایک بیٹی شہر بانو بھی تھیں جن کا عقد حضرت علی نے اپنے چھوٹے
بیٹے حضرت امام حسین سے کیا۔ان کے ہی بطن سے حضرت امام زین العابدین کی ولادت
ہوئی اور اس طرح یزدگرد کی بیٹی اسلامی تاریخ کی ایک مقدس ترین خاتون بن گئیں۔
حضرت علی کو جب تمام مسلمانوں نے اپنا خلیفہ تسلیم کیا اور انھوں نے اسلامی سلطنت کا اقتدار
سنبھالا تو ان کی خلافت کو وپیغمبر حضرت محمدؐ کی سب سے چھوٹی بیوی ام المومنین حضرت عائشہ نے
چیلنج کیا۔حضرت علی نے سیاسی اور جنگی مصلحتوں کی بنیاد پر اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ مدینے
سے عراق کے کوفہ شہر میں منتقل کر دیا اس طرح عراق ایک عام سرزمین کے بجائے ایک اہم

ترین اسلامی ملک بن گیا۔حضرت علی کو عراق میں رہ کر تین بڑی جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔پہلی
جنگ میں ان کا سامنا ام المومنین حضرت عائشہ کی افواج سے ہوا اس جنگ کو جنگ جمل کہا جاتا
ہے۔حضرت علی اس جنگ میں فاتح ہوئے اس کے بعد اسلامی خلافت کے ایک صوبے
شام (سیریا) کے گورنر امیر معاویہ نے حضرت علی کی اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت کر دی
جس کے بعد حضرت علی اور معاویہ کے درمیان صفین کے مقام پر جنگ ہوئی لیکن اس جنگ کا
کوئی نتیجہ نہیں نکلا کیوں کہ پہلے صلح کرنے کا ناٹک ہوا اور بعد میں حضرت علی کے مقرر کردہ صلح
کار کے ساتھ دہوکہ کیا گیا۔اس کے بعد حضرت علی کی فوج کے ایک ٹکڑے نے حضرت علی کے
مذاکرات کار ابوموسیٰ عشری کے ساتھ دھوکہ کئے جانے کے بعد دوبارہ جنگ شروع کرنے کی
ضد کی۔جس پر حضرت علی راضی نہیں ہوئے تو اس گروہ نے بغاوت کر دی۔حضرت علی کو ان
لوگوں کے ساتھ نہروان کے مقام پر جنگ کرنا پڑی۔ جنگ نہروان کے نام سے مشہور اس
جنگ میں حضرت علی کو پھر کامیابی ملی اور ان کے سامنے آنے والے اس گروہ کو اسلامی تاریخ
نے خارجی کے نام سے پکارا۔یہ وہی زمانہ تھا جب حضرت علی کی خلافت سے بغاوت کر کے
امیر معاویہ نے ایک آزاد شہنشاہی قائم کر لی اور اسلام کے نظام حکومت کے برخلاف رومی اور
ایرانی شہنشاہیوں کے طرز پر بڑے بڑے دربار اور قصر تعمیر کئے۔
27 جنوری کو سن 661 عیسوی یعنی 21 رمضان کو 40 ہجری میں حضرت علی سر کے اس زخم کی
وجہ سے شہید ہو گئے جو 19 رمضان کو مسجد کوفہ میں فجر کی نماز کے دوران عبدالرحمن ابن ملجم نام
کے ایک خارجی نے لگایا تھا۔حضرت علی نے اپنی آخری آرام گاہ کا شرف عراق کی سرزمین کو
ہی بخشا۔عراق کا ایک گمنام سا علاقہ 'نجف' حضرت علی کی آرام گاہ کی وجہ سے ان اسلامی شہروں
میں شامل ہو گیا جہاں سال بھر گلہائے عقیدت پیش کرنے کے لئے زائرین کا تانتا بندھا رہتا
ہے۔نجف کا شہر کوفے سے صرف چھ سات کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے بلکہ اب یہ دنوں شہر

جڑواں شہر کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

حضرت علی کی شہادت کے بعد ان کے بڑے بیٹے حضرت امام حسن کو مسلمانوں نے اپنا خلیفہ تسلیم کیا اور ان کو عنان حکومت سونپ دی لیکن ان کی حکومت صرف چھ مہینے ہی قائم رہ سکی اور شام کے بادشاہ معاویہ ابن ابوسفیان نے ان سے حکومت چھین کر پوری اسلامی سلطنت پر قبضہ کرلیا لیکن اس موقع پر امیر معاویہ اور حضرت امام حسن کے درمیان 26 جولائی 661 عیسوی میں ایک صلح نامہ پر دستخط ہوئے جس میں ایک شرط یہ بھی تھی امیر معاویہ کے مرنے کے بعد مسند اقتدار اولاد علی کو سونپ دی جائے گی۔ اس صلح نامہ کے بعد حضرت علی کے خاندان کے تمام افراد ایک بار پھر مدینہ کی طرف منتقل ہوگئے اور عملی طور پر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے خود کو اسلام اور بنی نوع انسان کی خدمت تک محدود کرلیا۔ اس معاہدے کے دس سال بعد حضرت امام حسن کو 28 صفر سن 50 ہجری مطابق 669 عیسوی میں زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد امیر معاویہ نے اسلامی حکومت کو اپنی خاندانی حکومت میں تبدیل کرنے کا پلان بنالیا۔ امیر معاویہ نے پہلے ہی اسلامی روشوں کو چھوڑ کر بادشاہت اختیار کر لی تھی اور بنی ہاشم کی قائم کردہ اسلامی حکومت کو بنی امیہ کی شاہانہ سرکار میں بدل دیا تھا۔ امیر معاویہ نے حضرت علی کے تمام فیصلوں اور تعلیمات کو پوری طرح نظر انداز کیا، خود کو حضرت علی سے پہلے والے تین خلفا کا جانشین قرار دیا اور حضرت علی نے اسلامی فقہ کے سلسلے میں جو اہم فیصلے کئے تھے ان کو امیر معاویہ نے اپنی مملکت میں نافذ کرنے سے انکار کر دیا۔

مسلمانوں میں جو فرقہ بندی ہوئی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ امیر معاویہ نے خلیفۂ راشد کہے جانے والے آخری اسلامی حکمراں کے راستے پر چلنے سے انکار کر دیا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اگر مسلمانوں کو حضرت علی کے زمانے میں رائج اسلامی قوانین کی پیروی کرنے سے نہ روکا گیا ہوتا تو آج مسلمانوں میں فرقہ بندی نہ ہوتی اور دنیا بھر کے مسلمان اسی فقہ کی پیروی

کر رہے ہوتے جو حضرت علی کے دور میں رائج تھی۔ امیر معاویہ نے اس معاملے میں اتنی سختی کی کہ جو لوگ حضرت علی کے تئیں محبت کا اظہار کرتے تھے ان کو سخت اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اتنا ہی نہیں امیر معاویہ نے بہت سے ملاؤں کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ منبروں پر جا کر حضرت علی کی شان میں گستاخیاں کریں۔

امیر معاویہ نے حضرت علی کی خلافت کو اسلامی خلافت کا سلسلہ ماننے سے ہی انکار کر دیا تھا اس لئے اس زمانے کے مسلمان حضرت علی کے شرعی فیصلوں اور اسلامی قوانین کی تشریحات سے دور رہے۔ ظاہر ہے جس شخص پر منبروں سے سب وشتم کیا جا رہا ہو اس کے دئے ہوئے فیصلوں پر کون عمل کرتا؟ اتنا ہی نہیں امیر معاویہ کے دور میں حضرت علی سے محبت کرنے والوں کو سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ حجر ابن عدی اور میثم تمار جیسے لوگوں کو بہت ظالمانہ طریقے سے شہید کیا گیا۔ یہ سب اسی دشمنی کا نتیجہ تھا جو امیر معاویہ کو بنی امیہ سے ورثہ میں ملی تھی۔

بنی امیہ نے مسلمانوں کی سیاسی قیادت پوری طرح چھین لینے میں کامیابی حاصل کر لی لیکن وہ بنی ہاشم سے امامت اور دینی قیادت نہیں چھین سکے۔ بنی ہاشم کے لوگ اسلام کے پیغام کو اپنے کردار سے پھیلاتے رہے۔ یہاں پر بنی ہاشم اور بنی امیہ کا مختصر تعارف دینا ضروری ہے تا کہ عام لوگ آسانی سے سمجھ سکیں کہ امامت، خلافت اور بادشاہت میں کیا فرق ہے۔

بنی ہاشم اور بنی امیہ

عرب میں قریش نام کا ایک بہت ہی طاقت ور اور محترم قبیلہ ہزاروں سال سے آباد تھا۔ اس قبیلہ کا مرکز عرب کا مقدس شہر مکہ تھا جہاں کعبہ نام کی وہ عمارت قائم تھی جس کو زمین پر اللہ کے گھر کا درجہ حاصل تھا۔ قریش کے لوگ ہی صدیوں سے مکہ کی دیکھ بھال کرتے آ رہے تھے۔
کچھ تاریخی حوالوں میں ملتا ہے کہ اسی قبیلہ کے ایک بزرگ عبد مناف کے گھر میں ایسے جڑواں بچے Siamese twins پیدا ہوئے جو پشت پر سے آپس میں جڑے ہوئے تھے اور ان کو جراح نے تلوار سے کاٹ کر الگ کیا اور ان کے نام ہاشم اور عبد شمس رکھے گئے۔ حضرت ہاشم کی نسل حضرت عبد المطلب سے چلی جب کہ عبد شمس کی نسل امیہ سے چلی۔ حضرت عبد المطلب کے پانچ بیٹے تھے۔ کچھ روایتوں میں تیرہ بیٹے ہونے کی بات درج ہے لیکن تذکرہ صرف پانچ کا ہی ملتا ہے جن کے نام ابوطالب، عبداللہ، ابولہب، العباس اور حمزہ تھے۔ پیغمبر حضرت محمد حضرت عبداللہ کے (اکلوتے) فرزند تھے اور حضرت علی حضرت ابو طالب کے بیٹے تھے۔ حضرت عبد المطلب کے پانچ بیٹوں میں سے صرف ابولہب ایسا تھا جس نے اسلام کو قبول نہیں کیا اور ان ہی پانچ بیٹوں میں حضرت ابوطالب بھی بھی تھے جن کو اپنے والد کے انتقال کے بعد قریش کی سرداری اور کعبہ کی تولیت ملی اور جنھوں نے حضرت محمد اور ان کے تمام ساتھیوں کو کفار مکہ کے شر سے محفوظ رکھا۔ حضرت علی حضرت ابوطالب کے بیٹے تھے جنھوں نے آنکھیں حضرت محمد کی آغوش میں کھولیں اور پھر ان آنکھوں کو حضرت محمد کی حفاظت کے لئے وقف کر دیا۔ انھوں نے بچپن سے ہی حضرت محمد کی حفاظت کا کام اپنے سر لے لیا تھا۔ مکہ میں کفار کے بچے جب (اپنے والدین کے سکھانے کے مطابق) حضرت محمد پر پتھر پھینکتے تھے تو حضرت علی ان لڑکوں کو دوڑا دوڑا کر پیٹتے تھے۔ جوانی میں انھوں نے بدر، احد، حنین

، خندق اور خیبر سمیت مختلف جنگوں میں اسلامی لشکر کو فتح سے ہمکنار کر کے حضرت محمد کی جان بچائی۔

حضرت محمد کا تکالیف پہنچانے میں بنو امیہ کا سب سے بڑا ہاتھ رہا۔ کچھ علما کا خیال ہے کہ Siamese twins کو تلوار سے کاٹ کر الگ کئے جانے کا ایسا اثر ہوا کہ بنی امیہ نے ہمیشہ بنی ہاشم کے خلاف تلوار کا استعمال کیا۔ بعض تاریخ نگاروں کا یہ بھی ماننا ہے امیہ کو عبد شمس نے گود لیا تھا اور وہ اس کا اصلی بیٹا نہیں تھا۔ سچ بات یہی لگتی ہے کیوں کہ جس قدر ظلم بنی امیہ نے بنی ہاشم اور دوسرے انسانوں پر ڈھائے اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ان کے ظالمانہ عمل کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگانا آسان ہے کہ دونوں قبیلوں کے لوگوں میں ایک ہی جد کا خون نہیں تھا۔ کہاں بنی ہاشم جو سخاوت، کرم، انسان دوستی، صبر، درگذر، بخش دینے اور معاف کرنے پر یقین رکھتے تھے اور کہاں بنی امیہ۔۔۔ جن کو بغض، حسد، کینہ، قتل، غارت گری ظلم، ستم اور وحشیانہ کاموں سے فرصت نہ ملی۔ بنی امیہ کی نسل امیہ کے دو بیٹوں حرب اور ابوالعاس سے چلی۔ حرب کی نسل میں ابوصفیان، معاویہ اور زیید ہوئے جب کہ ابوالعاس کے دو بیٹے ہوئے ایک عفان اور دوسرا الحکم۔ عفان کی نسل میں تیسرے خلیفہ حضرت عثمان ہوئے اور الحکم کی نسل میں مروان جیسا ظالم شخص پیدا ہوا جو اہلبیت رسول کا بہت بڑا دشمن تھا۔
جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے اسلام قبول کرنے سے قبل بنی امیہ نے رسول کریم کی ذات پر بے انتہا مظالم ڈھائے، ان کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ خاص طور پر ابوسفیان نے مظالم کی انتہا ہی کر دی۔ یہ ابوسفیان ہی تھا جس نے بار بار حضرت محمد کے خلاف سازشیں کیں اور ان پر حملے کئے یا حملہ کرنے والوں کا ساتھ دیا۔ یہ ابوسفیان ہی تھا جس کی بیوی ہندہ نے بنی ہاشم سے یوں دشمنی نکالی تھی کہ جب جنگ احد میں حضرت محمد کے چچا حضرت حمزہ شہید ہوئے تو ہندہ نے ان کی لاش کا سینہ چیر کر ان کو کلیجہ نکال کر اس کو چبایا تھا۔ لیکن یہ بنی ہاشم کا جگر تھا کہ فتح مکہ کے

موقع پر انھوں نے ہندہ اور ابوسفیان سمیت سب ہی قاتلوں اور ظلم ڈھانے والے مجرموں کو معاف کر دیا۔ ابوسفیان نے ذلت آمیز شکست کھانے کے بعد اسلام قبول کر لیا لیکن علما کا خیال ہے کہ ابوسفیان نے اسلام کے اندر داخل ہو کر اسلام کی جڑیں کھودنے کی بات دل میں ٹھان لی تھی اور اس کام کو بعد میں اس کی اولادوں نے انجام دیا۔ علما کا ماننا ہے کہ بنوامیہ کے جو سرکردہ افراد اور سردار بدر، احد، خندق کی جنگوں اور دوسری معرکہ آرائیوں میں حضرت علی کے ہاتھوں قتل کئے گئے اس کو بنوامیہ کے لوگ کبھی بھلا نہیں سکے اور اسی لئے جیسے ہی موقع ملا انھوں نے حضرت علی اور ان کی اولاد کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ یہ دشمنی اور نفرت اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئی جب 60 ہجری 680 عیسوی میں امیر معاویہ نے اپنے بدچلن اور اوباش بیٹے یزید کو مسند خلافت پر بٹھانے کا منصوبہ بنا لیا۔

ہزاروں مسلمانوں نے یزید کی جانشینی کو قبول نہیں کیا اور کوفے سمیت کئی شہروں سے مخالفت میں آوازیں اٹھنے لگیں۔ ادھر امیر معاویہ کی طرف سے یزید کی خلافت پر اسلامی غلاف چڑھانے کی کوششیں بھی تیز ہو گئیں اور اسلامی دنیا کے مقتدر حضرات سے یزید کی جانشینی کو حق بجانب قرار دئے جانے کی فرمائش کی جانے لگی۔ بعد میں یہ فرمائش جبری طور پر بیعت مانگنے میں تبدیل ہو گئی۔ پیغمبر حضرت محمد کے نواسے اور حضرت علی کے بیٹے امام حسین کی قیادت میں اہل بیت رسول نے یزید کی بیعت سے انکار کیا۔ جس کے بعد یزید نے اپنی کثیر فوج کے بل بوتے پر امام حسین سے بیعت لینے کی کوشش کی۔ امام حسین اور اہل بیت رسول نے یزید کی طاقت ور فوج کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ جس کے باعث ان کو مدینہ چھوڑ کر مکہ میں پناہ لینا پڑی لیکن یہاں بھی حاجیوں کے بھیس میں یزیدی فوجی ان کو قتل کرنے کے لئے پہنچ گئے۔ اس کے بعد امام حسین عراق کی جانب روانہ ہو گئے۔ وہ عراق کے شہر کوفے کی طرف جانا چاہتے تھے جہاں کے عوام ان کو اپنی قیادت کے لئے مسلسل بلا رہے تھے مگر جب ان کو کوفے

کے صحیح حالات کا علم ہوا تو انھوں نے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن راستے میں ہی ان کو یزیدی فوج نے گھیر لیا۔ جس کے بعد عراق کے ایک ویران قصبہ کربلا میں امام حسین کے بہتر ساتھیوں اور یزید کے ایک بڑے لشکر کے درمیان جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں امام حسین نے اپنی اور اپنے خاندان کے چراغوں کی قربانی دی۔ یہاں تک کہ ان کے چھ مہینے کے بیٹے حضرت علی اصغر کو بھی یزیدی فوج نے تیر کا نشانہ بنایا۔ اس جنگ میں یزید کی فوج نے کربلا سے گزرنے والی نہر فرات پر بھی قبضہ کر لیا تھا جس کے سبب امام حسین کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی ایک ایک بوند پانی کے لئے ترسنا پڑا۔

یہ امام حسین اور ان کے ساتھیوں کے مقدس خون کی ہی برکت تھی کہ کسی زمانے میں ایک ویران اور گمنام سے علاقہ کی حیثیت رکھنے والا قصبہ کربلا آج اسلامی دنیا کا ایک اہم ترین شہر بن گیا ہے۔ کربلا ایک ایسا نام بن گیا ہے جس کا رشتہ قربانی، ایثار، انسانیت نوازی، صبر، استقلال، جرائت مندی، مظلومیت، وفاداری اور پیاسوں کو پانی پلانے کی علامت بن گیا ہے۔ اس کے بارے میں آگے کے صفحات پر تفصیل سے بات ہوگی۔

امام حسین کی شہادت کے بعد یزید کو ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا اور ہر طرف سے اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کوفے میں امام کے ایک جانثار امیر مختار نے انتقام خون حسین کا نعرہ بلند کیا اور مدینہ میں عبداللہ ابن زبیر نے یزید کے خلاف جہاد چھیڑ دیا۔ عبداللہ ابن زبیر نے مکہ و مدینہ پر اپنا پرچم لہرا دیا تو یزید نے ان دونوں مقامات مقدسہ پر حملہ کر دیا اور اس کی فوجوں نے اس حد تک تجاوز کیا کہ کعبہ پر جلتے ہوئے تیر پھینکے یہاں تک کہ کعبہ کے پردے میں آگ لگ گئی۔ یزید کی افواج نے مدینے میں واقع مسجد نبوی کی بھی بہت بے حرمتی کی اور اس کے احاطے میں اپنے گھوڑے باندھے۔ یزیدی افواج نے اپنے حملے کے دوران سات سو حافظوں اور اصحاب رسول کو قتل کیا لیکن اس کا سب سے سنگین جرم حضرت

حسین ابن علی کو شہید کرنا اور رسول کی مقدس نواسیوں حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم سمیت تمام اہل بیت کو گرفتار کر کے جیل میں بھیجنا مانا جاتا ہے۔ یزید کی اس شرمناک اور ناقابل معافی حرکت کا ایسا سخت اثر ہوا کہ خود اس کے بیٹے معاویہ ابن یزید نے اپنے باپ کے جرائم کو دنیا کے سامنے رکھتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ وہ ایک ایسے تخت پر نہیں بیٹھ سکتا جس کے پائے آل رسول کے خون پر رکھے ہوں۔ بنی ہاشم کی کامیابی کا اعلان ایک ایسے گھر میں ہوا جہاں برسہا برس سے بنی ہاشم کے دشمنی پروان چڑھ رہی تھی۔ اسی کے ساتھ ابوصفیان کی نسل کا خاتمہ بھی ہو گیا کیوں کہ یزید کا بیٹا عین جوانی میں ہی اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ یزید صرف چار سال ہی حکومت کر سکا اور اس کے واصل جہنم ہونے کے بعد اہل بیت رسول کا ایک اور دشمن مروان سلطنت بنی امیہ کا فرماں رواں بن بیٹھا۔

تمام مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے بارے میں اس بات پر اجماع ہے کہ وہ حضرت علی پر ہی ختم ہو گئی (بہت سے مسلمان امام حسن کے چھ مہینے کے دور اقتدار کو بھی خلاف راشدہ کا حصہ مانتے ہیں) اور امیر معاویہ کے دور حکومت کو محض ایک ایسی مسلم ریاست کی شکل میں دیکھا جانے لگا جس نے اسلامی طرز حکومت کو چھوڑ کر بادشاہت اختیار کر لی تھی۔ شیعہ مسلمانوں نے کبھی خلافت راشدہ کو تسلیم نہیں کیا تھا وہ امامت کے قائل تھے اس لئے ان کے یہاں حضرت علی کی اولادوں کو امام ماننے کا سلسلہ جاری رہا ۔ یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ آنحضور کی وفات کے بعد مسلمانوں میں ان کے وارث کو لے کر اختلاف ہو گیا تھا۔ ایک گروہ خاندان رسالت کی سب سے اہم شخصیت اور علم وفضل وشجاعت میں سرفہرست شمار کئے جانے والے حضرت علی کے کو رسول کا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ اس گروہ کا کہنا یہ تھا اپنی وفات سے صرف دو ڈھائی مہینے قبل غدیر خم میں آنحضور اس بات کا اعلان کر چکے تھے کہ جس جس کا میں مولا ہوں اس کے علی بھی مولا ہیں لیکن مسلمانوں کا ایک گروہ اس بات پر اصرار کر رہا تھا کہ قریش کے کسی

بزرگ کو رسول کا جانشین بنایا جائے۔ جس وقت رسول کے اہل خانہ آنحضور کی تکفین وتدفین میں مصروف تھے اسی وقت مسلمانوں کا یہ گروہ مدینہ سے کچھ دور واقع ثقیفۂ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر کو اپنا خلیفہ منتخب کر رہا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس انتخاب میں خاندان بنی ہاشم کا کوئی فرد شامل نہیں تھا۔ رسول کی تدفین کے بعد خاندان رسالت کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ قریش کے لوگوں نے عمر زیادہ ہونے کی بنیاد پر آنحضور کے ایک صحابی حضرت ابوبکر کو خلیفہ منتخب کر لیا ہے۔ اس انتخاب کے بعد بنوامیہ کے سردار ابوسفیان نے حضرت علی سے کہا کہ یقینا ان کی حق تلفی ہوئی ہے اور اگر حضرت علی اپنا حق لینا چاہیں تو ابوسفیان مدینے کے گلی کوچوں کو فوجیوں سے بھر دے گا۔ حضرت علی نے ابوسفیان کو صرف ایک جواب دیا" اے ابوسفیان تو اسلام کا ہمدرد کب سے ہو گیا؟" حضرت علی جانتے تھے کہ ابوسفیان کی جانب سے اسلام کو برباد کرنے کے لئے یہ پیش کش کی گئی ہے کیوں کہ اس وقت جانشینی کی معاملے کو لے کر کوئی بھی لڑائی اسلام کی تباہی کا باعث بن جاتی۔ اس انکار کے باوجود بنی امیہ کے کچھ افراد لگاتار اسلام کو نقصان پہنچانے میں لگے رہے اور جب ان کو موقع ملا تو انھوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کو اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی کوشش کی۔ رسول کی تعلیمات کے مطابق حاکم اور محکوم کے لباس اور وضع قطع میں فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ حاکم کا گھر عالیشان نہیں ایک عام آدمی کے جیسا ہونا چاہیئے۔ حاکم کو دربار سجانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ آنحضور کی ان ہی تعلیمات نے اسلام کو پھیلنے کا بھرپور موقع دیا، آنحضور کا نہ تو اپنا کوئی محل تھا، نہ کوئی دربار، نہ حرم سرا اور نہ عالیشان قصر۔ مسجد نبوی ان کا دربار تھا جہاں فرشتے بھی آ کے سر جھکاتے تھے اور مدینے کے محلہ بنوہاشم میں ایک چھوٹا سا گھر تھا جہاں رحمتوں کا سایہ تھا۔

حضرت علی بھی کوفے کی مسجد میں بیٹھ کر تمام فیصلے کرتے تھے۔ وہیں ان کا دربار تھا اور وہیں ان کی عدالت اور وہیں ان کا منبر تھا جہاں سے وہ کہتے تھے سلونی سلونی ۔۔۔ پوچھ لو پوچھ لو

۔۔۔جو بھی پوچھنا ہے پوچھ لو۔۔۔اس سے قبل کہ تم مجھ کو کھو دو۔۔۔لیکن خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد بنوامیہ نے مسلمان حکمرانوں کو محلوں اور حرم سراؤں میں قید کر کے ان کو عوام سے دور کر دیا (یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔کئی مسلم بادشاہ آج بھی سنت رسول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عالیشان محلوں میں رہتے ہیں اور بیت المال کی رقم سے گل چھرے اڑاتے ہیں۔یہ لوگ عام مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم کرتے ہیں۔)

بنوامیہ کا اقتدار قائم ہو جانے کے بعد نسل امیہ تخت و تاج کے سہارے دنیاوی لذتوں کا مزہ لوٹنے میں میں مصروف رہی تو دوسری طرف بنی ہاشم کی جانب سے اسلام کی آبیاری اور دین کی بقا کا کام قران اور سیرت رسول کی روشنی میں پوری شان و شوکت کے ساتھ چلتا رہا۔

بنوامیہ کا دور اقتدار 40 ہجری سے 132 ہجری تک قائم رہا اور اس دوران کل ملا کر چودہ لوگوں کو حکومت کا موقع ملا۔اس درمیان بنی ہاشم مسلسل بنوامیہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے رہے لیکن بنی ہاشم نے ان مصائب کو نہایت حوصلے اور استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔بنی امیہ کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے امام زین العابدین کے بیٹے حضرت زید بن علی بھی شہید ہوئے اور ان کی شہادت کے بعد بھی ان سے دشمنی ختم نہیں ہوئی بلکہ ان لاش کو قبر سے نکال کر اس کی بے حرمتی بھی کی گئی۔بہر حال بنی امیہ کا خاتمہ ہوا اور بنی عباس نے اپنی حکومت قائم کی۔یہ لوگ کیسے تھے اور انھوں نے کیا کیا مظالم ڈھائے انسانوں پر اس کا بھی مختصر الفاظ میں حال بیان کیا جار ہا ہے

خلافت عباسیہ سے اب تک

مسلمانوں کے دور اقتدار میں مسلم مملکت ایک وسیع و عریض علاقہ میں پھیلی ہوئی تھی جس میں عراق، ایران، نجد، حجاز، یمن، مصر، اردن، حبش اور فلسطین جیسے ممالک شامل تھے لیکن بنی امیہ کے ظلم و ستم سے لوگ عاجز آ چکے تھے ان کو ایک نئے نظام حکومت کی تلاش تھی۔عوام کی نظریں خانوادۂ رسالت پر ٹکی تھیں اور عوام چاہتے تھے کہ بنو ہاشم کا کوئی فرد ان کی قیادت کرے۔عوام کی اسی خواہش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پیغمبر حضرت محمد کے سب سے چھوٹے چچا حضرت عباس ابن عبد المطلب کی نسل کے ایک فرد عبد العباس سفاح نے بنوامیہ کی سلطنت کو تاراج کر کے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

خلافت عباسیہ کے سلاطین جب برسر اقتدار آئے تو عوام کو لگتا تھا کہ یہ لوگ آل رسول کے ساتھ نرمی اور مروت کے ساتھ پیش آئیں گے کیوں کہ ابتدائی دور میں انھوں نے بنی ہاشم کی طرفداری ایک ہاشمی سلطنت کے قیام کا وعدہ کیا تھا۔ان کے کچھ سلاطین نے عوام کو گمراہ کرنے کے لئے آل رسول کے ساتھ ہمدردی جتانے اکا ناٹک بھی کیا۔اس کی وجہ سے یہ لوگ عوام کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن ان کے دلوں میں آل رسول کی محبت نہیں بلکہ دنیاوی عیش و عشرت کی لذتیں اٹھانے کا جذبہ اور مال و دولت حاصل کرنے کی خواہش موجزن تھی۔یہ لوگ بھی ظلم اور جور میں بنوامیہ سے کسی طرح کم نہ تھے۔اقتدار ملنے کے بعد انھوں نے بھی بنی ہاشم کو مظالم کا نشانہ بنایا۔

عباسیوں نے اقتدار پانے کے بعد بنی ہاشم کی حکومت کے بجائے خلافت عباسیہ قائم کی۔اس طرح وہ عوام سے کئے گئے وعدوں سے مکر گئے۔شیعوں کے چھٹے امام حضرت جعفر صادق کو تمام مسلمانوں کے فرقوں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ان کے علم و فضل و کمالات سے

دنیا کے تمام مسلمان فیضیاب ہوئے۔ ان کی امامت کے ابتدائی زمانے میں بنو امیہ کے حکمران مسلمانوں پر مظالم کا سلسلہ رواں رکھے ہوئے تھے۔ ان کے چچا حضرت زید ابن علی اور کئی دوسرے عزیزوں کو بنی امیہ نے بے دردی سے قتل کیا تھا۔ پھر امام جعفر صادق کے دور میں ہی بنی امیہ کا زوال شروع ہوا اور عباسیوں نے اپنی خلافت قائم کر لی۔ خلافت عباسیہ کے دور میں ہی امام جعفر صادق کو 765 میں خلیفہ منصور عباسی نے زہر دے کر شہید کروایا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے امام موسی کاظم کو امامت ملی۔

عباسی خلافت کے دوران عراق کوئی الگ ملک نہیں تھا بلکہ ایک وسیع حکومت کا صوبہ تھا۔ اس لئے صرف عراق کے بارے میں الگ سے تجزیہ کرنا مشکل ہے۔

786 میں ہارون رشید نے عباسی خلافت کی کمان سنبھالی اور دریائے دجلہ کے کنارے پر بغداد کے نام سے ایک نیا شہر آباد کر کے اس کو اپنی راجدھانی بنایا۔ ہارون نے عرب اور ایران کے آرٹ اور کلچر کو فروغ دینے میں کافی اہم کردار ادا کیا اس نے دنیاوی معاملات میں کافی ہوشیاری دکھائی لیکن جب دینی امور پر نظر ڈالی گئی تو وہ بھی آل رسول کی دشمنی اپنے دل میں دبائے ہوئے نظر آیا۔ وہ شیعوں کے ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم کا بہت دشمن تھا۔ ہارون نے بغداد کے قید خانے میں شیعوں کے ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم کو قید کر کے رکھا اور اسی قید خانے میں بعد میں ان کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا اور بعد میں ان کی لاش کو دجلہ کے پل پر رکھا گیا۔

ہارون نے آٹھویں امام حضرت علی رضا سے اس نے دشمنی اختیار کی۔ اس نے مکہ مدینے کے لوگوں کو اس بات کی ممانعت کر رکھی تھی کہ وہ امام رضا سے تعلیم حاصل کرنے یا ملاقات کرنے کے لئے خراسان کا رخ نہ کریں۔ حضرت امام رضا مدینہ چھوڑ کر ایران کے صوبے خراسان میں قیام پذیر تھے۔

ہارون رشید کو اقتدار ملنے کے کچھ ہی برسوں کے اندر بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسپین، مراقش، تیونس، خراسان، کرمان سیستان اور مصر میں علاحدہ مسلم سلطنتیں قائم کئے جانے کے لئے مسلح بغاوت شروع ہو گئی۔ اس طرح عباسیوں کے عہد میں کئی چھوٹے چھوٹے مسلم ممالک قائم ہو گئے۔ ہارون رشید کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا مامون رشید بادشاہ بنا۔ اس نے ایران کے کئی علاقوں میں روز بروز بڑھتی ہوئی شورشوں کو دیکھتے ہوئے ایرانی عوام کا دل جیتنے کے لئے ایک گہری سازش رچی اور شیعوں کے آٹھویں امام حضرت علی رضا کا اپنا جانشین بنانے کا اعلان کر دیا۔ مامون رشید کے اس اعلان کی وجہ سے اہل بیت رسول کو مسند اقتدار پر دیکھنے کی خواہش رکھنے والوں کا دل خوشی سے جھوم اٹھا لیکن بعد میں مامون نے یک سازش کے تحت ان کو زہر دے کر شہید کروا دیا۔

یہاں پر ایک بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ پیغمبر حضرت محمد نے فرمایا تھا کہ ان کے بارہ جانشین ہوں گے اور ان میں کے آخری جانشین امام مہدی ہوں گے جن کا نام محمد ہوگا۔ مامون رشید کا تعلق بنی عباس سے تھا اس لئے اس حدیث کے بارے میں اس کو اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کے دل میں ایک یہ بھی خواہش جاگی کہ پیغمبر حضرت محمد کا جانشین اس کی نسل میں سے ہو اسی لئے اس نے اپنی بیٹی ام فضل کی شادی امام رضا کے صاحبزادے حضرت محمد تقی سے کروا دی لیکن ام الفضل سے امام کی کوئی اولاد نہیں ہوئی بلکہ ان کی دوسری اہلیہ جو حضرت عمار یاسر کے خاندان سے تھیں ان سے امام کی نسل چلی۔ اصل میں ام الفضل کو امام کی دوسری شادی اور اولادوں کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی۔ امام نے اس بات کو صیغۂ راز میں اس لئے رکھا تھا کہ اگر مامون کو معلوم ہو جاتا تھا وہ ان کی اولادوں کو قتل کروا دیتا۔

218 ہجری میں مامون رشید کی موت کے بعد اس کے بھائی معتصم بن ہارون نے ملک کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ معتصم کے زمانے میں یہ ظلم بھی مسلمانوں پر روا ہوا کہ آل رسول سے عشق

کرنے والوں کو کافر قرار دیا گیا۔ معتصم کے درباری علمانے یہ فتویٰ جاری کیا کہ شیعہ فرقہ کے لوگ کافر ہوتے ہیں اوران کو دیکھتے ہی قتل کر دینا چاہئے اوران کا مال واسباب لوٹنے کی ہر کس و ناکس کو اجازت ہے۔ اسی شخص نے اپنی بھتیجی ام الفضل کے ساتھ سازش کر کے امام محمد تقی کو زہر دلوا کر شہید کر دیا۔ امام کا انتقال بغداد میں ہی ہوا اور وہیں وہ کاظمیہ کے علاقہ میں اپنے وادا کی قبر کے قریب مدفون ہوئے۔

معتصم کے زمانے میں ہی بغداد شدید قسم کے نسلی فسادات میں گھر گیا کیوں کہ خلافت عباسیہ کی حفاظت میں مامورترک نسل کے غلاموں (جن کو مملوک کہا جاتا تھا) کے مظالم سے بغداد کے عوام عاجز آچکے تھے جس کی وجہ سے ہر طرف انارکی اور فساد کا دور دورہ تھا۔ مجبور ہو کر معتصم نے اپنا دارالخلافہ اور فوجی چھاؤنی کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور 836 میں بغداد سے 125 کلو میٹر دور واقع سامرہ علاقہ میں ایک نئی راجدھانی وجود میں آگئی۔

امام محمد تقی کے بعد دسویں امام حضرت علی نقی امامت کے عہدے پر فائز ہوئے بچپن میں ہی ان کو بہت مشکل حالات کا سامنا کرنا کیوں کہ اس زمانے میں اہلبیت رسول کی دشمنی اپنے عروج پر تھی۔ امام علی نقی کی ولادت مدینہ میں ہوئی تھی کیوں کہ ان کی والدہ سمانہ خاتون مدینہ میں ہی قیام پذیر تھیں۔ بغداد میں آکر رہنے میں ان کے لئے خطرہ تھا۔ بغداد ان دنوں آل رسول کی قتل گاہ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بہت سے امام زادے مملکت عباسیہ سے ہجرت کر کے آس پاس کے ممالک میں بس رہے تھے۔ (ان ہی دنوں میں ہندوستان کے صوبے پنجاب میں امام علی نقی کے ایک بھائی حضرت علی ولی بھی تھانیسر کے علاقہ میں آباد ہوئے اور انھوں نے جس ویرانے میں قیام کیا اس کا نام اپنی والدہ کے نام پر سمانہ رکھا۔ (یہ جگہ پٹیالہ سے صرف 28 کلومیٹر دور واقع ہے)۔ ان کے چاہنے والے ان کو محبت سے امام مشہد بھی کہتے تھے کیوں کہ حضرت علی ولی مشہد میں اپنے جد حضرت امام رضا کے روضہ پر کئی برس رہ چکے تھے۔ کچھ تاریخ دانوں نے ان کو امام

علی رضا کا بیٹا بھی لکھا ہے کیوں کہ کچھ کتابوں میں امام رضا کے پانچ بیٹوں کا ذکر ملتا ہے۔ سچ جو بھی ہو چاہے وہ امام رضا کے بیٹے ہوں یا امام محمد تقی کے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ امام زادے ہیں اور ایسے واحد امام زادے ہیں جو ہندوستان میں دفن ہوئے۔)

امام علی نقی بغداد سے سینکڑوں میل دور مدینے میں رہ کر مسجد نبوی میں قران اور حدیث کا درس عوام تک پہنچا رہے تھے۔ ان کے علم وفضل کی وجہ سے ان کے چاہنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور یہی بات خلافت عباسیہ کے حکمرانوں کو ناپسند تھی۔ مدینے کا گورنر عبداللہ ابن محمد بھی آل رسول کے زبردست دشمنوں میں سے ایک تھا اس نے بغداد میں بیٹھے خلیفہ متوکل کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ امام علی نقی کی روز بروز بڑھتی مقبولیت سے عباسی خلافت کے لئے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے کیوں کہ کئی مسلم حکومتیں ان کو اسلحہ خریدنے کے لئے پیسہ دے رہی ہیں جس سے امام علی نقی اسلحہ خرید کر جمع کر رہے ہیں۔ متوکل نے اس خط کی سچائی جاننے کے لئے عبداللہ بن محمد کو معزول کر کے یحییٰ نام کے اپنے خاص درباری کو نیا گورنر بنا کر بھیجا اور اس کے ہاتھ امام کے نام ایک خط بھیجا جس میں ان کو سامرہ آنے کی دعوت دی گئی تھی اس خط میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ان کی جان کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ وہ مدینہ چھوڑ دیں حالانکہ متوکل چاہتا تھا کہ وہ امام علی نقی کو مدینے سے سامرہ میں منتقل کر کے ان کی مقبولیت میں کمی کر دے اور اگر سامرہ میں ان کو قید بھی کیا جائے تو یہاں ان کے ماننے والے نہیں ہیں اور کسی ہنگامہ کی امید نہیں ہے۔ اسی لئے ان کو دھوکے سے سامرہ بلا کر قید کرنے کا پلان متوکل نے بنایا تھا۔ یحییٰ نے امام کو خط دیا اور ان کے گھر کی تلاشی بھی لی تو اس کو قران کے نسخوں کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ امام بخوبی جانتے تھے کہ ان کو مدینہ سے ہٹا کر عراق کے شہر سامرہ میں بسانے کے پس پشت متوکل کی کیا مرضی ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ یہ دعوت نامہ ان کی حفاظت کی خاطر نہیں بلکہ ان کے درس و تدریس کو روکنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ان کو اس بات کی بھی خبر تھی کہ اگر انھوں نے سامرہ

جانے سے انکار کیا تو ان کو گرفتار کر کے لے جایا جائے گا جس کے باعث مدینے میں اضطراب پیدا ہو جائے گا جس کے نتیجے میں عوام اور حکومت کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت آ جائے گی۔ امام مسلمانوں کا خون بہتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے تھے اس لئے انھوں نے مدینے سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب یحییٰ امام علی نقی کو اپنے ساتھ لے کر بغداد پہنچا تو وہاں کے گورنر اسحاق بن ابراہیم نے (جو آل محمد سے محبت کرتا تھا) کہا کہ وہ بادشاہ کے دربار میں امام کو پیش کرتے وقت کوئی ایسا الزام نہ لگائے جس سے کہ بادشاہ کو امام کو قتل کرنے کا موقع مل جائے اور اگر امام قتل کر دئے گئے تو خاندان رسول کے ایک معزز فرد کے قتل کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر آئے گی اور یحییٰ کو حشر کے دن اس کی سزا ملے گی۔ یحییٰ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور اس نے متوکل سے کہا عبداللہ نے ان پر جو الزام عائد کئے تھے وہ بالکل جھوٹے اور بے بنیاد ہیں اور ان کے گھر سے کوئی بھی قابل اعتراض چیز نہیں ملی۔ اس کے بعد متوکل نے امام علی نقی کو ایک گھر میں مہمان بنا کر رکھا مگر یہ مہمان داری ایسی تھی کہ کوئی امام سے مل نہیں سکتا تھا اور امام کہیں آ جا نہیں سکتے تھے یعنی ان کو خانہ قید کیا جا چکا تھا۔ متوکل کا دور اس وقت ختم ہوا جب کہ اس کے ہی ایک بیٹے منتصر کی بنائی ہوئی سازش کے تحت اس کو ترکی النسل سپاہیوں نے قتل کر کر دیا۔ اس کے بعد معتمد عباس اور معتز عباسی کا دور آیا لیکن امام علی نقی کے ساتھ حکومت کا رویہ تبدیل نہیں ہوا کیوں کہ عوام کی رائے یہی تھی کہ تخت خلافت پر بیٹھنے کا حق آل رسول کا ہے اور امام علی نقی اال رسول ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے علم و فضل کی وجہ سے بھی خلافت کے حق دار ہیں۔ آخر کار معتز عباسی نے ان کو زہر دغا سے شہید کروا دیا۔ ان کی امامت کی مدت 34 برس رہی۔ امام کی شہادت کے بعد ان کے جانشین اور صاحبزادے امام حسن عسکری نے اپنے والد کی لاش کو غسل دیا، نماز جنازہ ادا کی اور اسی گھر کے سامنے ان کو دفن کیا جہاں وہ خانہ قید تھے۔ اس طرح سامرہ کی سرزمین کو بھی یہ شرف حاصل ہوا کہ وہاں آل رسول کے ایک مقدس فرد کی پہلی قبر بنی۔

امام حسن عسکری کی جانشینی

حضرت امام حسن عسکری ایک ایسے مظلوم امام ہیں جن کا بچپن اپنے والد کے ساتھ خانہ قید میں گزرا لیکن جب متوکل کے بعد منتصر نے عنان حکومت سنبھالی تو ان کو اور ان کے والد کو کچھ راحت کی سانس لینے کا موقع ملا لیکن منتصر کا دور حکومت زیادہ نہیں چلا اور اس کا قتل کر دیا گیا۔ پھر مستعین عباسی کو حکومت کا موقع ملا لیکن وہ بھی اہلبیت کی دشمنی میں کسی سے کم نہیں تھا۔ مستعین کا دور بھی زیادہ طویل نہیں رہا اور معتمد عباسی اور معتز عباسی کا دور بھی انھوں نے دیکھا۔ اپنے والد اور والدہ کے ساتھ رہ کر انھوں نے اتنی سختیاں برداشت کیں کہ جس کو بیان کرنے کے لئے علما نے پوری پوری کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کی اہلیہ نرجس خاتون کو بھی خانہ قید میں ہی زندگی گزارنا پڑی۔

امام علی نقی کے دو بھائی بھی ان کے ساتھ تھے جن میں سے ایک جعفر تواب کہے جاتے ہیں جن سے نقوی سیدوں کی نسل چلی ہے اور ان کے دوسرے بھائی سید محمد کہے جاتے تھے جو عراق کے شہر بلد میں دفن ہیں۔

امام حسن عسکری کو عسکری اس لئے کہا جاتا ہے کہ جہاں ان کو خانہ قید کیا گیا تھا وہ جگہ ایک فوجی مستقر تھی اور چوں کہ فوج کو عربی میں عسکر کہتے ہیں اس لئے امام کو عسکری کہا جانے لگا۔ امام پر اس قدر سختیاں پڑیں کہ صرف 28 سال کی عمر میں ہی ان کی شہادت ہو گئی۔ ان کو اپنے والد کی قبر کے نزدیک ہی سامرہ میں دفن کیا گیا۔ ان کی امامت کی مدت صرف چھ سال ری اور اس کے بعد ان کے پانچ سال کے بیٹے محمد بن حسن عسکری کو امامت ملی جن کو تمام شیعہ مسلمان امام مہدی آخرالزماں کہتے ہیں۔ امام مہدی کو عباسی بادشاہوں اور عوام کی نگاہوں سے چھپا کر پالا گیا تھا اور بہت سے لوگوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ امام حسن عسکری کی کوئی اولاد بھی ہے۔

چوں کہ رسول کی یہ حدیث سب مسلمان جانتے تھے کہ ان کے بعد ان کی نسل میں بارہ امام آئیں گے اس لئے عباسی حکومت کی یہ پوری کوشش تھی کہ امام حسن عسکری کی نسل کو ختم کر دیا جائے تا کہ (معاذ اللہ) رسول کی حدیث غلط ثابت ہو سکے۔ ایک طرف حکومت کی کوشش تھی کہ جانشین حسن عسکری دنیا میں آنے نہ پائے اور دوسری طرف خاندان رسالت کی کوشش یہی تھی کہ بارہویں اور آخری امام کو حکومت کے عتاب سے محفوظ رکھا جاسکے۔ اس لئے انھوں نے حضرت مہدی کی ولادت کو صیغۂ راز میں رکھا۔ امام حسن عسکری کی شہادت کے بعد ان کے بھائی جعفر نے بھی امامت کا دعویٰ کیا اور اپنے بھائی کی میت کو ایک بڑے مجمع کے ساتھ وہ دفن کرنے کے لئے لے چلے لیکن جب وہ نماز جنازہ پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے تو امام حسن عسکری کے پانچ سال کے بیٹے امام حسن عسکری سامنے آئے اور اپنے چچا کو بتایا کہ امام کی نماز جنازہ صرف امام ہی پڑھا سکتا ہے۔ جعفر تواب کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اپنے والد کی تدفین میں شریک ہونے کے بعد امام مہدی غیبت میں چلے گئے اور سامرہ میں ایک خفیہ مقام پر زندگی گزارنے لگے۔ ان کے چچا جعفر بن علی نے امامت کا دعویٰ کرنے کے لئے بعد میں بارگاہ خداوندی میں معافی مانگی اور اس قدر شدت سے مانگی کہ ان کو دنیا آج جعفر تواب کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جناب جعفر تواب کی جانب سے امامت کا دعویٰ ایک ایک سوچی سمجھی حکمت عملی تھی۔ وہ اپنے بھتیجے امام مہدی کو عباسی حکومت کے شر سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے امامت کی دعوے داری میں تضاد پیدا کر کے حکومت وقت کی نگاہیں اپنی جانب کر لیں اور امام مہدی کی زندگی کی حفاظت ہوتی رہی۔

امام مہدیؑ

عراق کی سرزمین کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ وہاں شیعوں کے آخری امام حضرت مہدی کی ولادت ہوئی اور اسی سرزمین پر انھوں نے اپنی امامت کے ابتدائی دن گزارے۔ سامرہ میں وہ غار آج بھی موجود ہے جہاں امام نے اپنی زندگی کا ایک حصہ گزارا اور پھر اللہ کے حکم سے غیبت کبریٰ میں چلے گئے۔

شیعہ اور سنی مسلمان اس عقیدے پر یقین رکھتے ہیں کہ قیامت سے قبل دنیا میں پیغمبر حضرت محمد کی نسل میں سے ایک ایسے مقدس شخص کی دنیا میں آمد ہوگی جو دنیا میں عدل و انصاف کا قیام کرے گا۔ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ یہ مقدس انسان تما دنیا کے مظلوموں کو ظالموں سے نجات دلوائے گا اور اس زمین کے طول وعرض پر حکومت کرے گا۔ پیغمبر کی نسل کے اس مقدس شخص کا نام بھی محمد ہوگا اور دنیا ان کو مہدی کہے گی۔ ان ہی کے دور میں حضرت عیسیٰ کو پھر سے زمین پر اتارا جائے گا جو امام مہدی کی امامت میں نماز ادا کریں گے۔

اسلامی علوم کے ماہر اسکالر موجان مومن نے حضرت مہدی کے بارے میں شیعہ اور سنی عقائد میں جو باتیں مشترک ہیں وہ اس طرح بیان کی ہیں۔

1۔ امام مہدی پیغمبر حضرت محمد کی نسل میں سے ہوں گے جن کا سلسلہ نسب امام حسن اور امام حسین سے ملتے ہوئے حضرت فاطمہ تک پہنچے گا

2۔ امام مہدی کا نام بھی محمد ہوگا۔

3۔ ان کے دور میں حضرت عیسیٰ زمین پر اتارے جائیں گے اور وہ عیسیٰ کی امامت کریں گے۔

4۔ ان کی آمد ایک سیاہ پرچم کے ساتھ ساتھ ہوگی۔

5۔ ان کی آمد کے وقت میں دنیا میں دجال بھی آئے گا۔

6۔جب وہ آئیں گے تو رمضان کے مہینے میں ایک ساتھ چاند اور سورج گہن ہوگا۔

7۔ان کی آمد سے پہلے مشرق سے چمکتا ہوا دم دار ستارہ برآمد ہوگا۔

8۔وہ دنیا میں اپنی حکومت قائم کریں گے۔

9۔وہ دنیا میں اس وقت عدل و انصاف پر مبنی حکومت قائم کریں گے جب کہ وہ ناانصافی سے بھر چکی ہوگی۔

10۔ان کی جبیں چوڑی، ناک بلند اور آنکھیں سرمگیں ہوں گی۔

شیعوں کے یہاں جو اضافی پہچانیں یہ بتائی گئی ہیں وہ اس طرح ہیں:۔

1۔ان کا عکس چاند کی سطح پر نظر آئے گا۔

2۔ان کے ظہور سے پہلے سرخ اموات (خون بہائے جانے) سے اور سفید اموات (ایک پر اسرار بیماری) سے لوگ بڑی تعداد میں ہلاک ہوں گے۔

3۔امام مہدی کے ظہور کے وقت، ایک آنکھ والا دجال، سفیانی نام کا ایک ظالم و جابر اور یمانی نام کا ایک ظالم بادشاہ دنیا میں لوگوں پر مظالم کرنے میں مصروف ہوں گے۔

4۔مسلمانوں کے جن علاقوں پر غیر ملکی قابض ہوں گے مسلمان ان کو واپس چھین کر غیر ملکیوں کو نکال باہر کریں گے۔

5۔شام کی سرزمین پر بہت زیادہ قتل و غارت ہوگا یہاں تک کہ شام کا خاتمہ ہو جائے گا۔(اسرائیل بھی پہلے شام کے علاقہ میں آتا تھا اس لئے غالباً یہ اسی کی طرف اشارہ ہے)

6۔عراق بالخصوص بغداد کے لوگ موت اور دہشت سے شدید طور پر متاثر ہوں گے۔ یہاں تک کہ آسمان میں ایک آگ دکھائی پڑے گی جس کی سرخی ان کو گھیر لے گی۔

7۔امام بہتے پانی پر اپنا مصلیٰ بچھائیں گے۔

8۔ان کا نورانی چہرہ حضرت عباس علمدار حسینی کا جیسا ہوگا۔

امام مہدی کے بارے میں حضرت محمد کی جو احادیث ہم تک پہنچی ہے ان میں سے کچھ یہاں پیش ہیں۔

حضرت علی نے فرمایا کہ انھوں نے پیغمبر کو کہتے سنا کہ ''مہدی ہم میں سے ہوگا یعنی پیغمبر کے قبیلے (بنی ہاشم) کا فرد ہوگا اور اللہ (اس کے ذریعہ سے) ایک رات میں کایا پلٹ کردے گا۔''

ترمذی میں آنحضور سے روایت لکھی گئی ہے کہ'' (امام) مہدی میری امت میں پیدا ہوں گے اور سات یا نو سال ایسی حکومت کریں گے کہ اگر کوئی ان سے امداد مانگے گا تو وہ اس کو اس طرح عطا کریں گے کہ اس کا دامن بھر جائے۔'' ایک اور حدیث یہ ہے کہ رسول نے فرمایا کہ ''یہ دنیا اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک کہ اس پر میری نسل کے ایک شخص کی حکومت قائم نہیں ہو جائے گی۔'' حضرت ام سلمہ سے منقول ہے کہ پیغمبر نے کہا'' اس (مہدی) کا ہدف ایک ایسی اعلیٰ قدروں پر مبنی حکومت کا قیام ہوگا جس میں تمام جھوٹے عقائد کا خاتمہ ہو جائے گا اور جس طرح طالب علم اسلامی درس گاہوں میں داخل ہوتے ہیں اسی طرح کفار اسلام کو قبول کرنے لگیں گے۔ حضرت ام سلمہ سے منقول دوسری روایت یہ ہے کہ اللہ کے رسول نے فرمایا '' کہ جب مہدی کا ظہور ہوگا تو اللہ سماعتوں اور بصارت کو اتنا وسیع کر دے گا کہ وہ مہدی ساری دنیا کو وہیں سے آواز دیں گے جہاں وہ موجود ہوں گے لیکن ساری دنیا ان کو بغیر کسی شخص کی معرفت کے ان کو دیکھ اور سن سکے گی۔ (ماضی میں لوگوں کو اس پیشین گوئی پر غور کرتے تھے تو سوچتے تھے کہ کوئی معجزہ ہوگا اور آسمان پر ان کی صورت ابھرے گی لیکن آج کی نسل سمجھ سکتی ہے کہ جب امام مہدی کا کعبہ میں ظہور ہوگا تو ساری دنیا کے ٹی وی چینلوں سے یہ منظر لائیو نشر کیا جائے گا) حضرت ام سلمہ سے منقول ہے کہ انھوں نے پیغمبر کو کہتے سنا کہ'' وہ میری نسل میں سے ہوگا۔'' اس مختصر سے تعارف کے بعد یہی کہنا ہے کہ امام مہدی کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے الگ سے درجنوں کتابوں کی ضرورت ہے۔

عباسی دور حکومت کا خاتمہ

آل رسول کا خون بہانے اوران کے چاہنے والوں پر طرح طرح کے ظلم توڑنے والے عباسی حکمرانوں نے دنیا کے ایک بڑے حصہ پر حکمرانی کی ان لوگوں نے اسلام اور اسلامی علوم کو بڑھانے کے بجائے عرب کے کلچر اور ثقافت کو آگے بڑھانے کا کام کیا۔ یہ لوگ نسل کے اعتبار سے تو حضرت محمد کے چچا حضرت عباس کے وارث تھے لیکن ان لوگوں کا رہن سہن ،طور طریقہ، انسانوں کے ساتھ سلوک اور حکومت کا طریقہ رسول کے طریقے سے رتی بھر بھی نہیں ملتا تھا۔ ان کو حکومت کی وسعت کے لئے حملے کرنے اور ملکوں پر قبضہ کرنے میں بہت مہارت حاصل تھی۔اسی لئے ان کے زیر اقتدار دنیا کا ایک بڑا حصہ آگیا یہ مسلمان تو تھے لیکن ان کی حکومت اسلامی نہیں تھی اور کسی بھی دنیاوی شاہی کی طرح ملک کی تعمیر وترقی کا کام کر رہی تھی۔عباسی بھی اموی بادشاہوں کی طرح اپنی حکومت کو پھیلانے کے لئے تلوار کا سہارا لے رہے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عباسیوں کے دور میں مسلمانوں نے دنیاوی امور میں بہت ترقی کی اور بغداد کو دنیا میں طاقت کا ایک بڑا مرکز بنا دیا۔اسی لئے انگریز مورخوں نے بعض عباسی خلفا کے دور کو عرب کی تاریخ کا سنہری دور لکھا لیکن ان انگریزوں نے آل رسول کے اس مقدس خون کو نہیں دیکھا جو ان کے تخت کے نیچے بہہ رہا تھا۔عباسیوں نے دو بار سامرہ کو دارالخلافہ بنایا اور پہلے 819–808 کے درمیان اور بعد میں 892–836 کے دوران سامرہ کو راجدھانی کی حیثیت حاصل رہی۔ بعد میں بغداد کو ہی تمام عباسی خلفا نے دارالحکومت بنائے رکھا۔

عباسیوں نے اپنے دور حکومت میں سادات کا خون اس قدر فراوانی سے بہایا کہ بغداد کی سڑکیں لہولہان ہوگئیں۔ان ہی لوگوں کے زمانے میں سیدوں کے خون سے دیواریں چنی گئیں

ان ہی لوگوں نے شیعہ اور سنی کی تفریق کو ہوا دی اور یہ نفرت اتنی بڑھ گئی کہ بغداد میں کئی بار شیعہ سنی فسادات ہوئے۔

بہر حال عباسیوں نے تقریباً پانچ سو سال تک بغداد پر حکومت کی لیکن 10 فروری 1258 کو چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان (Hulagu Khan) کی منگول فوجوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور مسلمانوں کو بری طرح تہہ تیغ کیا۔بغداد کے تخت خلافت پر بیٹھے المستعصم کو ہلاکو خان نے قالین میں لپیٹ کر گھوڑوں سے پامال کروایا۔اللہ نے ظالموں پر ایک ظالم مسلط کر دیا تھا۔بغداد پر منگلولوں کے قبضہ کے تین سال بعد عباسیوں کو مصر میں اپنی خلافت قائم کرنے کا موقع مل گیا اور وہ پھر سے مسلمانوں کے ایک طبقہ پر حکمرانی کرنے لگے۔

ادھر ایک اہم ترین کام یہ ہوا کہ ہلاکوں خان کے فوجیوں کا عام مسلمانوں کے ساتھ ربط وضبط بڑھا۔اس کے بعد ان کو معلوم ہوا کہ اصل اسلام وہ نہیں ہے جو انھوں نے عباسیوں کے دربار میں دیکھا تھا بلکہ اصل اسلام تو وہ ہے جو ایک عام مسلمان کی زندگی میں نظر آتا ہے۔مسلمانوں سے میل جول کا اثر یہ ہوا کہ ہلاکو خان کے ساتھ آنے والی منگول فوج مسلمان ہوگئی اور اس طرح وہ سلطنت جو مسلمانوں سے چھن گئی تھی پھر سے مسلمانوں کے پاس آگئی۔ یہ اور بات ہے کہ الگ الگ قوموں سے تعلق رکھنے والے مسلمان بادشاہ اپنے قبیلے کی حکمرانی قائم کرنے میں لگ گئے۔کبھی غزنوی، کبھی مملوک اور کبھی صفوی شہنشاہ مسلمانوں کی قسمت کے مالک بنے اور عراق کبھی کسی حاکم کے قبضے میں گیا تو کبھی کسی بادشاہ نے اس پر قبضہ کیا یہ سلسلہ کئی صدیوں تک چلتا رہا۔سولہویں صدی میں عراق ترکی کی خلافت عثمانیہ کے زیر اقتدار آگیا اور انیسویں صدی تک ان ہی کے قبضہ میں رہا۔ اس بیچ دو بار وہابیوں نے حملہ کر کے عراق کے مقدس شہروں کو تاراج کیا لیکن ان کو مکمل طور پر قبضہ کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن وہ حجاز ونجد میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

انگریزوں کے ناپاک قدم

سلطنت عثمانیہ کو 1920 میں برطانوی حکومت نے عراق سے اس لئے بے دخل کر دیا کیوں کہ اس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمنی کا ساتھ دیا تھا اور اسی بہانے مسلمانوں کے مقدس شہروں پر عیسائیوں نے اپنی حکومت قائم کر لی لیکن جیسے ہی عراقی مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ حکومت برطانیہ عراق کو اپنی کالونی بنانا چاہتی ہے انھوں نے برطانوی قبضہ کے خلاف بغاوت کر دی۔عراقی شیعوں کے رہنما آیت اللہ محمد تقی شیرازی نے ایک فتویٰ جاری کر کے برطانوی حکومت کی نوکری کو حرام قرار دے دیا،عراق پر برطانوی قبضہ کے خلاف شیعہ سنی ایک ہو گئے اور ہر طرف مظاہروں اور احتجاجی جلسوں کا اہتمام ہونے لگا۔ایسے ہی ایک احتجاجی جلسے میں عراق کے مسلمانوں نے پندرہ مسلمان قائدین کو اپنا رہنما منتخب کیا جنھوں نے عراق کی آزادی کے لئے حکومت برطانیہ سے گفت وشنید شروع کی لیکن برطانوی سول کمشنر Arnold Wilson نے ان کی مانگوں کو نامنظور کر دیا۔اس کے بعد شیعوں کے ایک جانباز اور شجاع مرجع تقلید شیخ مہدی الخالصی نے بھی حکومت برطانیہ کے خلاف فتویٰ جاری کیا جس کے بعد عراقی مسلح بغاوت پر اتر آئے اور 1920 میں جون کے مہینے کے اواخر میں عراق کے انقلابی مسلمانوں نے کربلا اور نجف سمیت کئی شہروں پر قبضہ کر لیا لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد برطانیہ نے اپنے ہندوستانی غلاموں اور برطانوی فوجوں کی مدد سے اس مسلح بغاوت کو کچل دیا۔اس بغاوت میں چھ ہزار شیعہ اور سنی مارے گئے۔کردوں نے بھی زبردست مزاحمت کی۔حکومت برطانیہ نے جانباز کردوں کو دبانے کے لئے فاسفورس کے مہلک بم استعمال کئے جن سے دس ہزار کرد شہری شہید ہوئے۔ان مظالم کے باعث اکتوبر کے مہینے میں پھر سے حکومت برطانیہ نے نجف اور کربلا سمیت مختلف عراقی شہروں پر دوبارہ کنٹرول حاصل کر لیا۔اس بغاوت میں

اہم ترین کردار نبھانے والے شیخ مہدی الخالصی ویسے تو عراقی شیعوں کے مرجع تقلید تھے لیکن ان کو پورے عراق کے شیعہ اور سنی احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔انھوں نے عراقیوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والے برطانوی سول کمشنر Arnold Wilson کے خلاف مہم بھی چھیڑی ہوئی تھی۔عراق کے روز بروز بگڑتے حالات کی وجہ سے برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل کی جانب سے لگاتار نئی نئی سازشیں ہو رہی تھیں۔برطانوی حکومت نے ملک میں ریفرنڈم کا ایک ناٹک بھی کیا لیکن شیخ مہدی نے اس کے خلاف بھی فتویٰ جاری کر کے عراقیوں سے ریفرنڈم سے الگ رہنے کی بات کہی۔پھر ایک گہری چال کے تحت برطانیہ نے اپنے ایک نمک خوار اور پرانے وفادار فیصل بن حسین الہاشمی کو عراق کے تخت حکومت پر کٹھ پتلی بنا کر بٹھا دیا۔فیصل کا باپ خلافت عثمانیہ کے زمانے میں شریف مکہ کے عہدے پر فائز تھا۔فیصل نے ماضی میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے لئے انگریزوں کے اشارے پر بھرپور مہم بھی چلائی تھی۔فیصل وہی آدمی تھا جس کے ساتھ صہیونیوں کے ایک بڑے رہنما Chaim Weizmann کے ساتھ 3 جنوری 1919 کو ایک معاہدے پر دستخط کئے تھے جس کے تحت فلسطین میں ایک صہیونی مملکت کے قیام کی راہ تلاش کرنے میں مدد دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔مسلمانوں کے ساتھ غداری کرنے کے اسی وعدے نے فیصل کو عراق اور مملکت شام کا شاہ بنا دیا تھا۔فیصل نے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کو کچلنے میں بہت اہم کردار نبھایا اور خود کو سنی ہاشمی خانوادے کا ممبر قرار دے کر اس نے سنی مسلمانوں کو اپنی طرف راغب کرنے میں کافی کامیابی حاصل کی۔فیصل نے انگریزوں کی مخالفت کرنے کے الزام میں شیعوں کے انقلابی مرجع تقلید شیخ مہدی الخالصی کو عراق سے جلاوطن کیا اور شیخ مہدی کو پانی کے جہاز سے بمبئی بھیج دیا تاکہ وہ ہندوستان میں جلاوطنی کی زندگی گزار سکیں لیکن بمبئی میں ان کو وہاں کے کچھ مقامی ملاؤں نے جہاز سے اترنے نہیں دیا کیوں کہ ممبئی کے مولویوں کو لگ رہا تھا کہ اگر ایک عراقی

مرجع تقلید یہاں آ گیا تو ان کی دکان داری کیسے چلے گی؟ لیکن یہ کام حکومت برطانیہ کے اشارے پر ہوا تھا جو ہندوستان میں چل رہی تحریک آزادی سے پہلے ہی سے پریشان تھی وہ شیخ مہدی الخالصی کو ہندوستان میں رہنے دینا نہیں چاہتی تھی۔ ممبئی میں جب پناہ نہیں ملی تو اس انقلابی رہنما کو مجبوراً عدن جانا پڑا جہاں سے حج کرنے کے لئے مکہ چلے گئے ان کو مکہ کے حاکم شریف حسین نے حج کی دعوت دی تھی۔ وہ حج پر گئے تو وہاں ان کو ایران کے وزیر خارجہ محمد مصدق نے ایران آنے کی دعوت دی۔ جب وہ ایران کی بندرگاہ بوشہر پہنچے تو وہاں موجود ایرانین آئل کمپنی کے ایک افسر نے ان پر دس گولیاں چلا کر ان کی جان لینے کی کوشش کی لیکن وہ بچ گئے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام انھوں نے مشہد مقدس میں گزارے۔ کچھ عرصے بعد فیصل نے ان کو اس شرط پر عراق واپس آنے کی دعوت دی کہ وہ سیاست میں مداخلت نہیں کریں گے۔ شیخ مہدی نے فیصل کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔ صرف تین سال بعد مشہد مقدس میں ہی ان کا انتقال ہوا گیا۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی موت فطری نہیں تھی بلکہ کہ ان کو مشہد میں تعینات برطانوی قونصل کے اشارے پر زہر دے کر شہید کیا گیا تھا۔

ادھر عراق میں فیصل کی کٹھ پتلی حکومت چلتی رہی اور یہ نام نہاد شاہی انگریزوں کی غلامی کا حق ادا کرتی رہی لیکن عراقی عوام کی لگا تا جدوجہد آخر رنگ لائی اور حکومت برطانیہ نے 1932 میں عراق کو محدود آزادی دینے کا اعلان کر دیا۔ 1933 میں شاہ فیصل نے سویزرلینڈ میں اس جہاں سے کوچ کیا اور اس کی جگہ پر اس کے بیٹے شاہ غازی کو حکمراں بنا دیا گیا۔ شاہ غازی کویت کے عراق میں دوبارہ الحاق کا حامی تھا جس کو انگریزوں نے ایک سازش کے تحت عراق سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا اور اپنی غلامی میں لے رکھا تھا۔ غازی کو کاروں کی ریس کا بہت شوق تھا اور اسی شوق نے اس کی جان لے لی۔ 1939 میں بجلی کے ایک کھمبے سے اس کی کار ٹکرا گئی جس کے نتیجے میں اس کی موت ہوگئی۔ عراقی عوام کے ساتھ ایک بھدہ مذاق ہوا اور غازی کے

چار سال کے بیٹے شاہ فیصل ثانی کو حکمراں بنا دیا گیا اور سلطنت کا مختار غازی کے بھائی شاہ عبداللہ کو بنا کر حکومت اسی کو سونپ دی گئی۔ اسی درمیان 1945 میں برطانیہ نے عراق کو پوری طرح آزاد کر دیا اور عراق اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ ابھی ٹھیک سے آزادی کی سانسیں لینا نصیب بھی نہیں ہوئی تھی کہ کرد لیڈر مصطفیٰ برزانی نے علاحدہ کرد مملکت کی تحریک چھیڑ دی لیکن ان کو کامیابی نہیں ملی اور ان کو بھاگ کر روس میں پناہ لینا پڑی۔ اس بیچ عراق میں فوجی بغاوتیں بھی ہوئی اور عراق کو اسرائیل کے ساتھ پہلی عرب اسرائیل جنگ میں شرکت بھی کرنا پڑی لیکن ہاشمی سلطنت چلتی رہی۔ عراق کی معاشی حالت خراب تھی اسرائیل کے ساتھ ہونے والی جنگ کے اخراجات اور فلسطینی مہاجرین پر تیل سے ہونے والی آمدنی کا چالیس فی صد پیسہ خرچ ہو رہا تھا۔ ایسے خراب حالات میں 1953 میں عبداللہ نے اپنے بھتیجے شاہ فیصل ثانی (جو جوان ہو چکا تھا) کو عراق کا اقتدار سونپ دیا۔ اس کے پانچ سال بعد عراقی فوج کے برگیڈیئر عبدالکریم قاسم اور کرنل عبدالسلام عارف نے شاہ فیصل ثانی اور اس کے اہل خانہ کو قتل کر کے ملک کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح وہ وہاں فوجی ڈکٹیٹروں کا دور شروع ہوا۔

عبدالکریم قاسم کمیونسٹ نظریات رکھنے والا شخص تھا۔ اس لئے اس نے مغربی دنیا سے عراق کے رشتے منقطع کر کے روس کی طرف پینگیں بڑھائیں۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی شاہ کے زمانے میں عائد کی گئی تھی اس کو ہٹا لیا اور اس نے بھی کویت کے عراق کے ساتھ الحاق کی وکالت کی اور برطانیہ کے ساتھ کئے گئے کئی معاہدوں کو منسوخ کر دیا۔ قاسم نے ایران کے ساتھ بھی لڑائی کرنے کا بہانہ تلاش کیا اور ان علاقوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جو خلافت عثمانیہ کے عہد میں ایران میں شامل کر دئے گئے تھے۔ اس نے ایران کے صوبے خوزستان میں چل رہی عرب علاحدگی پسند تحریک کو بھی ہر طرح کی مدد پہنچانا شروع کی لیکن دونوں ممالک کے درمیان جنگ نہیں ہوئی۔ 1961 میں برطانیہ نے کویت کو آزاد کر دیا جس کے بعد عراق نے فوراً مطالبہ کیا کہ

کویت کا الحاق اس کے ساتھ کیا جائے لیکن برطانیہ نے کویت کو عراق میں شامل کئے جانے کی شدید مخالفت کی اور اپنی فوجیں اس کی مدافعت کے لئے بھیج دیں۔ عراقی حکومت خاموش ہو کر بیٹھ گئی اور آخر کار دو سال بعد اس نے کویت کو ایک آزاد مملکت کے روپ میں تسلیم کرلیا۔

1963 میں فروری کے مہینے میں عراق کی بعث پارٹی نے عبدالکریم قاسم کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کرلیا لیکن نو مہینے کے اندر ہی عبدالسلام عارف نے بعث پارٹی کی حکومت کو اقتدار سے بے دخل کر کے مسند صدارت پر قبضہ کرلیا۔ تقریباً پانچ سال بعد جولائی 1968 میں بعث پارٹی ایک بار پھر بغاوت کرنے میں کامیاب ہوئی اور عراق فوج کے ایک جنرل احسن البکر، صدام حسین اور صالح عمر العلی نے عارف کا تختہ پلٹ دیا۔ بعث پارٹی نے ایک مضبوط حکومت قائم کی احسن البکر کو صدر اور صدام حسین کو نائب صدر کا عہدہ ملا لیکن احسن البکر کبھی فعال صدر کی حیثیت سے کام نہیں کر سکے اور سارے اہم کام نائب صدر صدام حسین کے سپرد رہے۔ صدام حسین نے اس بیچ بعث پارٹی میں اپنی پوزیشن بہت مضبوط کر لی اور صدر احسن البکر کو بے دست و پا کر دیا۔ صدام حسین کے دباؤ میں آ کر جولائی 1979 میں احسن البکر نے استعفیٰ دے دیا۔ صدام حسین نے اس کے بعد ملک کے صدر اور پارٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے ملک پر اپنا اقتدار جمالیا۔

صدام حسین

صدام حسین نے اقتدار پر قبضہ جماتے ہی پہلا نشانہ ان اپنی ہی پارٹی کے ان لوگوں کو بنایا جو مستقبل میں اس کے لئے خطرہ بن سکتے تھے۔ 22 جولائی 1989 کو صدام حسین نے بعث پارٹی کے لیڈروں ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ بلائی جس میں اس نے کہا اس کو خفیہ اطلاعات ملی ہیں کہ اندر ہی اندر اس کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ پھر اس نے سازش کرنے والے مبینہ گروہ کے ایک ممبر محی عبدالحسین سے کہا کہ وہ اپنا اقبالیہ بیان ممبران کے سامنے پڑھے اور سازش کرنے والے اپنے ساتھیوں کے نام بتائے۔ محی عبدالحسین نے 68 لوگوں کے نام لئے اور ان سب کو جلسے میں سے نکال کر ایک کمرے میں بند کیا گیا ان میں سے 22 ممبروں کو پھانسی دے دی گئی اور بقیہ کو فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس سفاکانہ کارروائی کے ذریعہ صدام نے سارے عراق کے اہل سیاست کو صاف طور پر یہ بتا دیا تھا کہ ان کی مخالفت کرنے والے ہر شخص کا یہی انجام ہوگا۔

صدام حسین نے ملک سے شریعت کا قانون ختم کر کے ایک سیکولر قانون نافذ کیا اور مشرق وسطیٰ کی تاریخ میں پہلی بار مغربی طرز کے قانونی نظام کو رائج کیا۔ صدام نے عراقی تیل کی صنعت کو قومیانے کا کام بھی کیا اور ملک میں تعمیر و ترقی کا کام کافی تیزی سے آگے بڑھایا اس زمانے میں عراق کی کرنسی دنیا کی سب سے مہنگی کرنسیوں میں سے ایک تھی۔

صدام نے ملک میں امن و امان لانے کے لئے کردوں کے ساتھ ایک معاہدہ بھی کیا اور ان کو خودمختاری بھی دی لیکن یہ معاہدہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد عراقی افواج نے کردوں پر زبردست بمباری کی اور ان کو بڑے پیمانے پر ہلاک کیا۔ عراقی جہازوں نے ایران کی سرحد کے اندر بھی کرد ٹھکانوں پر حملے کئے جس سے ایران اور عراق کے درمیان تناؤ

پیدا ہوگیا۔

اسی زمانے میں عراق اور کویت کے درمیان بھی پھر سے کشیدگی ہوگئی کیوں کہ کویت نے شط العرب میں عراق کو ایک بندرگاہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی لیکن ٹکراؤ نہیں ہوا کیوں کہ صدام حسین کو معلوم تھا کہ کویت اور برطانیہ کے درمیان گہرے فوجی تعلقات ہیں۔

70 کی دہائی کے درمیانی برسوں کے دوران عراق اور ایران کے بیچ میں آبنائے ہرمز میں تین جزیروں اور شط العرب میں جہاز رانی کے حقوق کو لے کر کشیدگی پیدا ہوگئی لیکن بعث پارٹی کی حکومت کی ایک نہ چلی کیوں کہ ایران کا شاہ رضا پہلوی امریکہ کی ایک بڑی کٹھ پتلی تھا اور اس کی طاقت کے آگے عراق زیرو تھا۔ صدام نے 1975 میں ایران کے شاہ کے ساتھ تینوں جزائر کو لے کر ایک معاہدہ کرلیا۔ اس معاہدے کے بعد ایران کے شاہ نے صدام حسین کو کردوں پر ظلم ڈھانے کی پوری چھوٹ دے دی۔ عراقی حکومت نے کردوں کی مسلح بغاوت کو پوری طرح کچل دیا۔

ادھر ایران میں بھی شاہی کے خلاف اسلامی انقلاب انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اسلامی انقلاب کے بانی آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی (مرحوم) عراق کے مقدس شہر نجف میں تھے جہاں سے ان کے پیغامات لگاتار ایرانی نوجوانوں تک پہنچ رہے تھے۔ ایران کے شاہ کو اس معاملے میں بہت تشویش تھی اس نے صدام حسین سے کہا کہ وہ امام خمینی کو عراق سے باہر کردے۔ صدام حسین نے شاہ ایران کی درخواست قبول کرتے ہوئے 1978 میں امام خمینی کو عراق چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ امام خمینی عراق سے فرانس پہنچ گئے اور یہی ایرانی انقلاب کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہوا۔ پیرس میں امام خمینی کو انٹرنیشنل میڈیا کی معرفت اپنی بات کہنے کا زیادہ موقع ملا اور ان کے پیغامات مزید آسانی کے ساتھ ایرانی نوجوانوں تک پہنچنے لگے۔ اسلامی

انقلاب ایران کے ہر شہر کی ہر سڑک پر عوام کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی شکل میں نظر آنے لگا۔

امام خمینی کو عراق سے نکالے جانے کے اندر ہی اسلامی انقلاب کامیابی کی منزلوں میں پہنچ گیا۔ یہ انقلاب امریکی مفادات کے خلاف آیا تھا اور امریکہ کی نظر میں اس کا خاتمہ ضروری تھا اس لئے اس نے صدام حسین کی خدمات حاصل کیں۔ صدام حسین نے شط العرب میں جہاز رانی کے حقوق اور آبنائے ہرمز کے تینوں جزیروں کو عراق کو دئے جانے کے مطالبے کو لے کر ایران کی اسلامی حکومت پر 22 ستمبر 1980 کو حملہ کردیا۔ جنگ کے ابتدائی دنوں میں ایسا لگا کہ ایران کو جنگ میں زبردست مات ہوگی اور عراق ایران کے ان علاقوں پر قبضہ کرلے گا جہاں عربی بولنے والے لوگ بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ امریکہ نے علاقہ کی عرب حکومتوں کو بھی ڈرایا ہوا تھا کہ اگر انھوں نے عراق کا ساتھ نہیں دیا تو ایران کا اسلامی انقلاب ان کی مملکت کو بھی نگل جائے گا۔ اسی خوف کو ہوا دے کر امریکہ نے خلیجی ممالک سے صدام حسین کو بڑے بڑے قرضے دلوائے۔ اس جنگ کو مزید کامیابی عطا کرنے کے لئے مغربی میڈیا نے اس کو عربی اور عجمی کا رنگ بھی دینے کی کوشش کی۔ ایران پر اس حملے کو جنگ قادسیہ کہے جانے کی کوشش بھی ہونے لگی۔ ویسے تو صدام حسین کا اسلام یا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ایران پر ہونے والے اس حملے کو مغربی میڈیا شیعہ اور سنی فرقہ کے درمیان کی جنگ قرار دینے پر مصر تھا اور صدام کو ایک سنی قائد کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کر رہا تھا لیکن صدام حسین کا امریکہ کی ایک کٹھ پتلی ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا کردار اس جنگ میں تھا ہی نہیں۔ امریکہ اسلامی انقلاب کو ختم کرنا چاہتا تھا اور امریکیوں کی جانوں کا اتلاف نہ ہو اس لئے براہ راست حملہ کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس نے خلیج میں موجود اپنے ایجنٹوں سے عراق کو بھرپور مدد فراہم کروائی تھی اور ان کو قرضے دینے کے لئے کہا تھا تاکہ امریکہ کسی طرح انقلاب اسلامی کو ختم کرسکے

عراقی افواج امریکہ کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کی فراہم کردہ اطلاعات کی بنیاد پر ایران کے کئی
علاقوں میں گھس گئیں لیکن جیسے ہی ایران کے اسلامی انقلاب پر جان نثار کرنے والے
پاسداران انقلاب نے عام فوجیوں کو ہٹا کر کمان اپنے ہاتھ میں لی تو جنگ کا نقشہ ہی بدل
گیا۔ ایرانیوں نے عراق کے فرعون کو خون کے سمندر میں غرق کرنے کا پروگرام بنایا اور عراقی
اسلحوں کو رگ گردن سے مات دینے کی مہم شروع کی۔ اسلامی انقلاب کی طغیانی اپنی بانہوں
میں سمیٹے انسانی لہریں عراق کی سرحدوں سے ٹکرانے لگیں اور صدام حسین کو زبردست شکست
کا سامنا کرنا پڑا۔ ایرانی علاقوں پر قبضہ تو درکنار عراق کے کچھ حصہ بھی ایران کے پاس چلے
گئے۔ صدام حسین کو اپنے ملک میں شدید خفت کا سامنا تھا۔ اس موقع پر عراق کی کیبنٹ میں
وزیر اور صدام کے ایک معتمد خاص ڈاکٹر ریاض ابراہیم نے صدام سے کہا کہ وہ جنگ میں
شکست کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے عارضی طور پر استعفیٰ دے دیں۔ صدام نے اس
مشورے کو اپنی کیبنٹ کے پوری طرح جمہوری ہونے کے ثبوت کے بطور استعمال کیا لیکن کچھ
ہی دنوں بعد ان کو عہدے سے نہ صرف برطرف کر دیا گیا بلکہ ان کی لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کر
کے ان کے گھر بھیج دیا گیا۔

صدام حسین نے جنگ جاری رکھی اور ایران کو زیر کرنے کے لئے غیر انسانی طریقے استعمال
کرنے کا فیصلہ کیا صدام نے کئی یوروپی کمپنیوں سے مہلک کیمیائی ہتھیار اور چلی کی کمپنی سے
کلسٹر بم خریدے اور ایرانیوں پر اس سے حملے کرنا شروع کئے۔ جس کی وجہ سے ایرانی افواج
کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ آخر کار یہ جنگ اگست 1988 میں اس وقت ختم ہوئی جب
امام خمینی نے عراق کے ساتھ جنگ بندی کا حکم دے دیا۔ یہ جنگ جو آٹھ سال تک لڑی گئی اور
جس میں دس لاکھ سے زیادہ لوگوں کی جانیں گئیں وہیں پر ختم ہوئی جہاں دونوں ملکوں کی
سرحدیں پہلے تھیں۔ اس جنگ سے صدام حسین کو کچھ حاصل نہیں ہوا بلکہ ملک دیوالیہ ہو گیا۔

صدام حسین پر 166 بلین ڈالر کا بیرونی قرض چڑھ چکا تھا جس کو چکانے کے لئے عراق کو اپنے
کنوں سے تیل زیادہ مقدار میں نکالنا پڑ رہا تھا۔ اوپیک کی پابندیوں اور تیل کی گرتی قیمتوں
نے صدام حسین کی مصیبتوں میں مزید اضافہ کیا۔ ایک خوشحال ملک بدحالی کی کگار پر پہنچ چکا
تھا۔ عراق میں امریکی مفادات دم توڑ چکے تھے اب صدام حسین کو لگا کہ ایران کے ہاتھوں جو
ہزیمت اٹھانا پڑی ہے اس کا غم کچھ غلط کیا جائے۔ انھوں نے کویت پر الزام لگانا شروع کر دیا
کہ وہ عراقی تیل کو زمین کے اندر ہی اندر چرا رہا ہے۔ بات بڑھتی گئی۔ امریکہ بھی اندر ہی اندر
صدام کو ہوا دیتا رہا کیوں کہ اس نے صدام حسین سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سی آئی اے نے صدام حسین کو اس قدر اونچا کر دیا کہ صدام نے 2 اگست 1990 کو کویت
پر حملہ کر دیا اور بڑی آسانی سے کویت پر قبضہ جما لیا۔ اس حرکت نے سعودی عرب اور خطہ کے
دوسرے امریکہ نواز امیروں اور بادشاہوں کی راتوں کی نیند اڑا دی کیوں کہ ان کی افواج بھی
صرف اپنے شہریوں پر ظلم ڈھانے کے علاوہ کسی کام کی نہیں تھیں۔ امریکہ نے سرعت سے
کارروائی کرتے ہوئے اپنی اور 34 اتحادی ممالک کی افواج سعودی عرب، بحرین، قطر،
مصر، ترکی اور اسرئیل میں اتار دیں۔ صدام کو امید تھی کہ امریکہ اس کو صرف دھمکا رہا ہے وہ حملہ
نہیں کرے گا اور کسی طرح کی فوجی کارروائی کا ارادہ نہیں کرے گا لیکن صدام کو یہ نہیں معلوم تھا
کہ امریکہ اس کی ڈوریاں کاٹنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ امریکہ نے امریکہ نے پانچ مہینوں کی
زبردست تیاری کے بعد 16 جنوری 1991 کو عراق پر ہوائی حملے شروع کر دئے۔ امریکہ
نے ہوائی حملوں سے عراق کی کمر توڑ دی ایک مہینے تک چلنے والے ان حملوں کے بعد امریکہ
نے 23 فروری کو زمینی حملہ کر دیا اور صرف 100 گھنٹوں کے درمیان صدام کے خوابوں کو چکنا
چور کرتے ہوئے عراق کی افواج کو کویت سے نکال دیا۔ امریکہ نے شمالی عراق کے کرد
اکثریت والے علاقوں کو بھی عراق سے منقطع کر دیا اور اس کو نوفلائی زون بنا کر عراق جہازوں کو

وہاں اتارنے کی ممانعت کردی۔صدام حسین کے اس حملے کو امریکہ نے اپنی اور یوروپ کی اسلحہ ساز فیکٹریوں کی جیب بھرنے کے لئے استعمال کیا۔تمام عرب ملکوں میں امریکی افواج اتاردی گئیں۔جس سرزمین کی حفاظت کبھی ابابیلوں نے کی تھی اس کی حفاظت کے لئے امریکہ کے بدکردار سپاہیوں کو مامور کر دیا گیا۔امریکہ نے بغداد، بصرہ اور کئی دوسرے اہم شہروں کو تاراج کر دیا۔صدام حسین کو ہزیمت اٹھانا پڑی لیکن اس کو بھی عام مسلمانوں نے شکست نہیں مانا بلکہ صدام حسین کو ایک ایسے ہیرو کے روپ میں تسلیم کیا جو امریکہ جیسی طاقت کو آنکھیں دکھانے کا دم رکھتا تھا۔ہندوستان کے کئی شہروں میں صدام حسین کو خلیفتہ المسلمین کہہ کر امریکہ جیسی بڑی طاقت سے ٹکرانے پر مبارک باد کے پوسٹر لگائے گئے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ صدام حسین نے عام مسلمانوں اور جذباتی لوگوں کا مزید دل جیتنے کے لئے اسرائیل اور سعودی عرب میں موجود اتحادی فوجوں پر بھی دو چار میزائیل داغ دئے تھے۔ان حملوں کے بعد دنیا بھر کے میڈیا کا رخ اچانک تبدیل ہو گیا وہ صدام حسین جو کسی زمانے میں ایک کٹر سنی مسلمان کی طرح پروجیکٹ کیا گیا تھا اور جس کے نام کے ساتھ قادسیہ کا لقب جوڑ دیا گیا تھا۔وہی صدام ایک رات میں کافر بعثی اور مرتد قرار دیا جارہا تھا۔یہاں پر ایک قصہ بیان کرنا ضروری ہے۔

کویت پر حملے سے کچھ برس پہلے میں بی بی سی کی ہندی سروس کے لئے انٹرویو دینے گیا تو میں نے کہا تھا کہ صدام حسین کو شیعہ سنی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے وہ بعث پارٹی کا لیڈر ہے جو عرب قوم پرستی پر یقین رکھتی ہے۔میرے اس جواب پر انٹرویو بورڈ میں بیٹھے مسٹر بدھوار بہت مضحکہ خیز انداز میں ہنس رہے تھے ان کو لگ رہا تھا کہ مجھے عراق اور ایران کی جنگ کا پس منظر معلوم ہی نہیں ہے۔خدا کا شکر ہے میں آج بھی اپنے خیال پر قائم ہوں لیکن کویت پر حملہ ہوتے ہی بی بی سی کا لہجہ ایسا بدلا کہ وہ صدام حسین کو بعثی اور کافر کہنے سے بھی نہیں چوکے۔امریکہ سے شکست کھانے کے بعد بھی صدام حسین کی پالیسیوں میں تبدیلی نہیں آئی حالانکہ امریکہ کے ایما

پر اقوام متحدہ نے جو اقتصادی اور معاشی پابندیاں لگائی تھیں ان کی وجہ سے عراق کی معیشت پوری طرح تباہ و برباد ہو چکی تھی۔عوام کی آسائشوں سے بھری زندگی اچانک غربت و افلاس کا شکار ہو گئی۔

کویت سے عراقی فوجوں کے واپس چلے جانے کے بعد امریکہ نے عراق کے علاقوں میں اپنی پیش قدمی روک دی لیکن امریکی صدر بش کا مزاج بھی بڑا جنگجو یانہ اور وحشیانہ تھا اس لئے بش سینئر نے عراق کے عوام کو بھوکا مارنے کی سازش رچی۔صدام حسین کے عزائم کی سزا عراق کے عوام کو دینے کا مقصد یہ تھا کہ وہاں کے عوام صدام حسین کے خلاف بغاوت کر دیں لیکن امریکہ کو ذرا بھی کامیابی نہیں ملی۔امریکیوں کو لگتا تھا کہ انھوں نے صدام حسین کی حکومت کو تہس نہس نہ کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے اس لئے وہ صدام حسین کو معزول کرنے کی سازشوں میں لگ گئے۔انھوں نے یہ پروپگینڈہ شروع کر دیا کہ عراق نے عوامی تباہی کے ہتھیار حاصل کر لئے ہیں۔امریکہ کے اشاروں پر ناچنے والی اقوام متحدہ نے بھی اس کا سخت نوٹس لیا اور امریکا کے جھوٹے الزامات کی جانچ کرنے کے لئے ایٹمی توانائی کی ایجنسی کے انسپکٹر، یو این کی جانچ کمیٹیاں اور نہ جانے کون کون سی تنظیمیں روز عراق کا دورہ کرنے لگیں اور صدام حسین کی جانب سے عدم تعاون کا بہانہ کر کے جھوٹ موٹ روتی رہیں۔ساری دنیا جانتی تھی کہ صدام حسین کے پاس گھر چلانے کے لئے پیسے نہیں بچے ہیں بھلا وہ ایٹمی ہتھیار کہاں سے بنائے گا؟ مگر امریکہ کی جانب سے یہی کہا جا رہا تھا کہ عراق کے ہر شہر میں ایسے ہتھیار بھرے پڑے ہیں جو انسانوں کی تباہی و بربادی کی وجہ بن سکتے ہیں۔۔۔اور انسانیت کا درد امریکی سیاست دانوں سے زیادہ بھلا کس کے دل میں ہوگا؟ امریکہ کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے مسلسل جال بنے اور آخر کار بش کا جانشین اس کا بیٹا بش ہو گیا۔اس شخص نے دل میں قسم کھا رکھی تھی کہ وہ صدام حسین کو ختم کر کے ہی دم لے گا کیوں کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ حضرت عیسیٰ آئے

ہیں اور اس سے کہہ رہے ہیں کہ وہ عراق پر حملہ کرے۔بش ایک عیسائی مبلغ کا کردار ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے ہتھیاروں کو سہارا لیتے ہوئے عراق پر 20 مارچ 2003 کو حملہ کر دیا اور اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صدام حسین کی سیاسی غلطیوں کی سزا عراقی عوام کو دینا شروع کی۔اس جنگ میں بھی مختلف عیسائی ممالک شریک تھے لیکن ان کے ساتھ وہ مسلمان ممالک بھی شامل تھے جو اپنے ملک کے تخت پر نہیں امریکہ کے کاندھوں پر بیٹھے ہیں۔صدام کے دامادوں نے اپنے خسر کے خلاف بغاوت کی لیکن بعد میں معافی ملنے پر عراق واپس آ گئے۔ جہاں ان کو گولی مار دی گئی۔صدام نے عراق کے شیعوں پر بھی بہت مظالم کئے خاص طور عراق کے سب سے بڑے شیعہ عالم دین مرحوم آیت اللہ العظمیٰ خوئی کو خانہ قید کیا ان کا مدرسہ گروا دیا ان کے بیٹوں کو قتل کروایا اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کو بہت اذیتیں دیں۔عراق کے معروف عالم دین اور اسلامی فقہ و اقتصادیات کے ماہر آیت اللہ باقر صدر اور ان کی بہن بنت الھدیٰ کے ساتھ صدام حسین کی فوج نے انتہائی وحشیانہ سلوک کیا اور ان کو اذیتیں دے دے کر مارا۔لاکھوں شیعوں کو ایران کا ہمدرد قرار دے کر ان کو ایران کی سرحد پر ڈھکیل دیا۔ان میں میری نانی کے بھائی علامہ حسین شہرستانی کا خانوادہ بھی شامل تھا۔اس خانوادے کے چشم و چراغ علی شہرستانی کو ایک دن عراقی فوج اٹھا کر لے گئی تو پھر خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں گئے۔ان کے دوسرے بھائی عباس نے جرمنی میں پناہ لی لیکن ایسا سلوک صرف شیعوں کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ ہزاروں سنی بھی اسی طرح کے عتاب کا شکار ہوئے۔

صدام کے دور میں ایک اندازہ کے مطابق ایک لاکھ تیس ہزار شیعوں کو قتل کیا گیا۔صدام نے کردستان میں بسنے والے سنی مسلمانوں کو بھی شدید ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا اور ایک لاکھ کردوں کو تہہ تیغ کیا۔اس کے علاوہ بھی عراق کے کئی شہروں میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے افراد کی

اجتماعی قبریں بھی ملیں جن کو صدام کی افواج نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ایک اندازہ کے مطابق صدام حسین کے دور اقتدار میں کل ملا کر دس لاکھ شہری ہلاک کئے گئے۔اس کے علاوہ ایران عراق جنگ کے دوران بھی دس سے پندرہ لاکھ عراقی ہلاک ہوئے تھے۔

صدام نے بہت ہوشیاری کے ساتھ خود ایک کٹر سنی مسلمان کے روپ میں عراق کے سنیوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ بھی عجب مذاق تھا کہ سنیوں کے اس سب سے بڑے نام نہاد ہمدرد کو ختم کرنے کے لئے جو فوج آ رہی تھی اس کا سارا خرچ پڑوس کی سنی ریاستیں ہی اٹھا رہی تھیں۔تمام خلیجی ممالک دامے درہمے اور سخنے عراق میں مسلمانوں کا خون بہانے والی امریکی افواج کے ساتھ تھے۔بغداد پر مسلط ظالم کو ختم کرنے کے لئے ایک بار پھر ظالموں کا لشکر آ رہا تھا۔بالکل ویسا ہی منظر تھا جیسا کہ بنی عباس اور ہلاکو خان کے زمانے میں تھا۔مظلوم درمیان میں تھے اور ظالم سے ظالم برسر پیکار تھا۔کچھ لوگ صدام حسین کو ایک شیعہ دشمن حکمراں کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کر رہے تھے لیکن صدام حسین نہ تو شیعہ تھا نہ سنی وہ تو بعث پارٹی کے اصولوں پر یقین رکھنے والا ایک عرب رہنما تھا۔جو صدام کا وفادار تھا اس کو ہر سہولت حاصل تھی جو صدام کا مخالف تھا وہ قابل گردن زنی تھا۔صدام حسین کے ڈکشنری میں معافی نام کا کوئی لفظ نہیں تھا۔جو صدام کا دوست تھا اس کو ہر طرح کی سہولت حاصل تھی اور جو صدام کا دشمن تھا اس کے لئے موت کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔صدام نے جب اپنے دامادوں کو معاف نہیں کیا تو عام آدمی بھلا معافی کی کیا امید کرتا؟

صدام حسین کے وزیر اطلاعات و نشریات محمد سعید الصحاف کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ شیعہ تھا لیکن آخری وقت تک وہ صدام حسین کی وکالت کرتا رہا یہاں تک کہ بغداد میں امریکی فوجیں داخل ہو چکی تھیں لیکن صحاف میڈیا سے یہی کہہ رہا تھا کہ جنگ تو ہم جیت رہے ہیں اور امریکیوں کو ہر موقع پر شکست ہو رہی ہے۔صحاف کو صدام حسین نے جو اہمیت دی ہوئی

تھی اس سے معلوم پڑتا تھا کہ صدام حسین کو شیعوں سے دشمنی نہیں تھی بلکہ ہر اس شخص سے دشمنی تھی جو اس کا مخالف تھا۔ اسی طرح سنی فرقہ کے ساتھ بھی ہمدردی کا پروپگینڈہ سراسر جھوٹ پر مبنی تھا کیوں کہ صدام نے کردستان کے اپنے سنی بھائیوں پر ذرا سا رحم بھی کبھی نہیں کھایا اور ان پر کیمیکل ہتھیاروں سے حملہ کروانے میں بھی ذرا سی جھجھک محسوس نہیں کی۔ بہرکیف ہلاکو خان کی طرح یہ جنگ امریکہ نے جیتی۔ صدام حسین کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا اس کے پورے خانوادے کو امریکیوں نے ختم کر دیا۔ پھر امریکیوں نے اپنی کٹھ پتلی سرکار وہاں قائم کر دی جس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے صدام حسین کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن عراقیوں کی قسمت میں امن کا کوئی لمحہ نہیں آیا۔ ہر طرف قتل و غارت گری منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ بم دھماکوں اور خودکش حملوں نے عراقی عوام کی زندگی اجیرن کر دی۔ امریکی حملے کے بعد سے اب تک ایک اندازہ کے مطابق بارہ لاکھ عراقی ہلاک ہو چکے ہیں یا گمشدہ لوگوں کی فہرست میں شامل ہیں معذوروں کی تعداد کی تو کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ عورتوں کی قسمت میں بیوگی اور بچوں کی قسمت میں یتیمی لکھ دی گئی ہے۔ تقریباً پینتالیس لاکھ لوگ عراق سے ہجرت کر کے آس پاس کے ممالک میں کیمپوں میں مہاجروں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ کوئی اپنے گھر میں محفوظ ہے نہ سڑک پر۔۔۔ مجھے ایک ایسے ملک میں جانے کا موقع مل رہا تھا جس کے بارے میں بچپن سے میں بس سنتا آیا تھا۔ دو وجہوں کی بنا پر، میں نہایت خوش تھا پہلی تو یہ کہ عراق میں اپنے آقا کے دربار میں حاضری دینے کا شرف مل رہا تھا دوسرا یہ کہ میرے سفر کے آخری دن ہی امریکہ کے صدر براک حسین اوبامہ کی جانب سے وہاں سے امریکی افواج کے انخلا کی تاریخ معین کی گئی تھی اور ایک بار پھر عراق کے عوام کو آزادی کا حسین تحفہ ملنے والا تھا۔ میں عراق کے حال و ماضی میں کھویا تھا اور میرا جہاز بادلوں کا سینہ چیرتے ہوئے بحرین کی طرف رواں دواں تھا۔

خوابوں کی دنیا میں

جب ہم اور عین الحسن منامہ کے ائیر پورٹ پر اترے تو وہاں کی مقامی گھڑیوں میں صبح کے نو بجے تھے۔ ہمارا سامان نجف تک بک تھا اور ہم کو منامہ اور نجف کی فلائٹ کا بورڈنگ پاس بھی دہلی میں مل گیا تھا اس لئے جہاز سے اترنے کے بعد ہم لوگ سیدھے اس گیٹ کی طرف چل دئے جہاں سے نجف کی فلائٹ ایک گھنٹے بعد جانے والی تھی۔ ائیر پورٹ کے اسی گیٹ پر آغا سلطان، ان کے والد مرزا عباس بیگ، اور ڈاکٹر رضا سے ملاقات ہوئی۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ گلف ائیر لائن کی فلائٹ سے نجف کے لئے روانہ ہو گئے۔ شائد یہ دنیا کی پہلی ایسی فلائٹ تھی جس کے روانہ ہوتے ہی تمام مسافروں نے ایک ساتھ مل کر نعرۂ صلوات بلند کیا اور پھر محمد و آل محمد پر صلواتوں کے سائے میں یہ جہاز فضا کی اونچائیوں کو چھونے لگا۔ ایک گھنٹے بعد ہم کو شہر امیر المومنین کے نزدیک آنے کی اطلاع پائلٹ کے اعلان کے ذریعہ ملی اور بس کچھ منٹ کے بعد ہم اس سرزمین پر تھے جس کو فرشتے ہر دن سلام کرنے کے ئے زمین پر آتے ہیں۔ نجف کی مقدس سرزمین پر جہاز اترا تو پھر بھرپور نعرۂ صلوات بلند کیا گیا اور فلائٹ اسٹیورڈ نے عربی زبان میں امیر المومنین کے کچھ مناقب بیان کئے اور نجف کی سرزمین کے بارے میں کچھ کہا۔ مجھے عربی سے اپنی ناواقفیت کا افسوس ہر قدم پر تھا۔

ہم نجف کے ہوائی اڈے پر اترے تو دل فرط مسرت سے ایک بحر بیکراں میں تبدیل ہو چکا تھا ۔ میرا سفینہ ساحل نجات پر پہنچ چکا تھا۔ میں خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی تصور کر رہا تھا۔ گو کہ نجف کا ہوائی اڈہ نظر کے سامنے تھا لیکن ابھی بھی دل کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ سب کچھ ایک خواب لگ رہا تھا۔

نجف کا ہوائی اڈہ کسی بین الاقوامی ہوائی اڈے کی طرح نہیں ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ امریکہ کے

قابض حکام نے اپنی افواج کی آمدورفت کے لئے جو ہوائی پٹی بنائی تھی اس کو ہی بعد میں شہری ہوابازی کے لئے وقف کردیا۔ ہوائی اڈے Arrival Terminal دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ کسی فوجی بیرک کو ہوائی اڈے میں بدل دیا گیا ہو۔ بہرحال ہم کو آم کھانے سے مطلب تھا پیڑ گننے سے کیا غرض؟ ہم لوگ ہوائی اڈے میں داخل ہوئے تو ہر طرف مسافر ہی مسافر تھے چوں کہ اس دن تین شعبان تھی اس لئے مومنین دور دور سے یہاں پہنچ رہے تھے تاکہ امام حسین کے جشن ولادت کے موقع پر اپنے مولا کی بارگاہ میں پہنچ کر نذرانۂ عقیدت پیش کرسکیں۔

ٹرمنل میں ہمارے خیر مقدم کے لئے امام حسین کے روضے کے خدام آئے ہوئے تھے۔ تین وجیہ نوجوان ہم لوگوں کو لینے کے لئے عتبۃ الحسینیۃ کی جانب سے بھیجے گئے تھے۔ ان لوگوں نے ہم لوگوں کے ویزے اور پاسپورٹ لے لئے اور امیگریشن کی کارروائیاں پوری کرنے میں لگ گئے۔ ہم لوگ اپنی اپنی نشستوں پر ہی بیٹھے رہے۔ نجف کا ائیر پورٹ شائد دنیا کا ایسا واحد ائیر پورٹ ہے جہاں ٹرمنل کے اندر سگریٹ پینے کی اجازت حاصل ہے۔ اس لئے سگریٹ پھونک پھونک کر وقت گزارا۔ مسافروں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ ہم لوگوں کو امیگریشن میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ یہاں ہم کو پیپر ویزہ جاری کیا گیا اور ہم باہر نکلے تو ٹرمنل کے بالکل باہر ہی ہمارے لئے دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک گاڑی میں ہم، عین الحسن اور ڈاکٹر رضا سوار ہوئے دوسری گاڑی میں آغا سلطان اور ان کے والد دو عراقی لڑکوں کے ساتھ تھے۔ ہمارا دل تو چاہ رہا تھا کہ پہلے مولا علی کے رُوضے پر حاضری دیں پھر کربلا کے لئے روانہ ہوں لیکن ہمارے میزبانوں کا کہنا تھا کہ ہم لوگوں کو کربلا جلد سے جلد پہنچنا ہے کیوں کہ وہاں عصر کے وقت پر افتتاحی پروگرام شروع ہونا ہے۔ ہمارے کاریں فراٹے بھرنے لگیں۔ نجف سے کربلا کا سفر شروع ہوا راستے کے دونوں طرف مختلف بورڈ لگے تھے جن پر موکب امام حسین، موکب رسول، موکب امام علی، موکب فاطمہ زہرا، موکب امام حسن، موکب حضرت زینب۔ موکب حضرت

ابوالفضل، موکب حضرت علی اکبر، موکب امام سجاد اور موکب حبیب ابن مظاہر جیسے نام لکھے تھے۔ کربلا کے ہر شہید اور دیگر متبرک اسلامی شخصیتوں کے نام سے موسوم موکبوں کا لامتناہی سلسلہ پورے راستے میں کہیں ختم نہیں ہوا۔ ہم کو موکب کے معنی نہیں معلوم تھے تو پریشان تھے کہ آخر یہ ہے کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں موکب ان انجمنوں کو کہتے ہیں جو جلوسوں اور جلسوں میں شریک ہونے والے مومین کو مختلف سہولتیں پہنچاتی ہیں۔ نجف سے کربلا تک کے پورے راستے میں سڑک کے دونوں طرف عراق کی مختلف انجمنوں نے زمینیں خرید لی ہیں اور جب نجف میں کوئی پروگرام ہوتا ہے تو کربلا سے نجف تک جانے والوں کے چائے، شربت اور کھانے پینے کی چیزیں فراہم کرنے کے علاوہ کچھ دیر آرام کرنے اور نماز پڑھنے کے لئے یہاں پر بہترین انتظامات کئے جاتے ہیں۔ کچھ موکبوں نے تو مسجد اور حسینیہ کی شکل میں پختہ عمارتیں بنادی ہیں۔ کربلا میں منعقد ہونے والی خصوصی تقریبات میں شرکت کرنے کے لئے نجف اور کوفے سے کربلا جانے والے مومنین کے لئے بھی ایسے انتظامات کئے جاتے ہیں۔ عموماً نوے کلومیٹر کی یہ مسافت مومینن پیدل ہی طئے کرتے ہیں۔

ہم لوگ نجف سے سیدھے کربلا کے لئے روانہ ہوئے۔ ہماری گاڑیاں 180 کلومیٹر کی رفتار سے بھی زیادہ تیز چل رہی تھیں۔ راستے میں کئی جگہوں پر چیکنگ ہو رہی تھی لیکن ہماری گاڑیوں کی کہیں چیکنگ نہیں ہوئی کیوں کہ ان پر خاص اسٹیکرز لگے ہوئے تھے اور جو عراقی نوجوان ہم سب کو لینے آئے تھے وہ تلاشی لینے والوں کو عربی زبان میں یہ بتاتے جا رہے تھے کہ یہ لوگ ہندوستان سے جشن ربیع الشہادہ میں شریک ہونے کے لئے آئے ہیں۔ اسی سبب ہم کو کہیں بھی تلاشی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اورنہ ہر چار پانچ کلومیٹر کے بعد ایک چیک پوسٹ ضرور موجود تھا۔ ہم کو تعجب اس بات پر تھا کہ ائیر پورٹ پر یا راستے میں کہیں بھی کوئی امریکی افسر یا فوجی ہم لوگوں کو کہیں دکھائی نہیں پڑا۔ نجف سے کربلا تک کا 90 کلومیٹر کا سفر صرف ایک گھنٹہ میں طئے ہوا

کربلا شہر

کربلا کے بارے میں ہم لوگوں نے ذہن میں پتہ نہیں کیسی تصویر قائم کر رکھی تھی ہم کو لگتا تھا کہ وہاں ابھی بھی دور تک ریت کا صحرا ہوگا۔ اونٹوں اور بھیڑوں کو چرانے والے دیہی باشندے ہوں گے لیکن نجف سے کربلا تک کے راستے میں نہ تو کہیں صحرا تھا نہ عرب کے قدیم تمدن کی کوئی جھلک نظر آرہی تھی۔ سڑکوں پر ایک ایک سے خوبصورت کار دکھائی پڑ رہی تھی۔ مکان بھی ٹھیک ٹھاک سے نظر آرہے تھے کچھ فیکٹریاں اور کارخانے بھی راستے میں تھے۔ شہر کربلا صوبۂ کربلا کی راجدھانی ہے جو دو حصوں میں بٹی ہے۔ ایک حصہ کو قدیم کربلا کہا جاتا ہے اور ایک کو نیو کربلا کہا جاتا ہے۔ نیو کربلا میں زیادہ تر سرکاری دفاتر، اسکول اور رہائشی بلڈنگیں ہیں۔ جب کہ پرانے علاقہ میں مدرسہ، زیارت گاہیں اور مسجدیں ہیں اس علاقہ میں 100 مسجدیں اور 23 دینی مدرسے ہیں۔ پرانے شہر کے قلب میں امام حسینؑ کا روضہ واقعہ ہے۔ 2003 کی مردم شماری کے مطابق کربلا کی کل آبادی 572,300 لوگوں پر مشتمل ہے۔ پہلے کربلا کی آبادی بہت زیادہ تھی لیکن یہاں کے مختلف علاقوں کو آس پاس کے شہروں میں ملا دئے جانے کی وجہ کربلا کی آبادی کم ہوگئی۔ کربلا ایک جدید شہر کی طرح ہی لگتا ہے۔ ہر جگہ موبائل اور انٹرنٹ شاپس موجود ہیں۔ سائبر کیفے کی سہولت بھی جگہ جگہ دستیاب ہے۔ عوام کا لباس عام ہندوستانیوں کی طرح پینٹ شرٹ ہے۔ یہاں کے نوجوان بھی جینس اور ٹی شرٹ پہننے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں کے بازاروں میں دینار نام کی کرنسی چلتی ہے۔ سوڈالر کے بدلے آپ کو ایک لاکھ اٹھارہ ہزار دینار ملتے ہیں۔ ایرانی کرنسی تومان بھی یہاں کے دکاندار خوشی خوشی قبول کرتے ہیں اس کی قیمت عراق دینار کیتقریباً برابر ہے۔ ہندوستانی کرنسی بھی چینج کروانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ چالیس روپئے کے ایک ہزار دینار ملتے ہیں۔ کربلا کو عراق کے امیر

ترین شہروں میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں پہلی تو یہ کہ یہاں ہر روز ہزاروں زائرین کے آنے کہ وجہ سے مقامی آبادی کے معاشی حالات سدھر رہے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کربلا کے آس پاس کی زمین زراعت کے لئے بہت اچھی ہے اور یہاں کی کھجوریں دنیا بھر میں ایکسپورٹ ہوتی ہیں اس سے بھی یہاں کے معاشی حالات ٹھیک ہوئے ہیں۔ لوگوں کی آمدنی بڑھنے کی وجہ سے یہاں مکانوں اور زمینوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور اب کربلا پراپرٹی کے معاملے میں دنیا کے سب سے مہنگے شہروں میں شامل ہوگیا ہے۔

کربلا میں داخل ہوتے ہی ہمارے ڈرائیور نے بلند آواز میں کہا السلام علیک یا ابوالفضل العباس۔۔۔ میں جیسے ہی ڈرائیور کی آواز سن کر متوجہ ہوا سامنے دیکھا تو سب سے پہلی نظر حضرت عباس کے روضے پر پڑی۔۔ فرط خوشی سے دم نکلنے کو تھا اور آنکھوں میں اشکوں کو سمندر کو جزن تھا وہی روضہ میرے سامنے تھا جس کو اب تک میں صرف تصویروں میں دیکھا کرتا تھا۔ مجھے اپنے آس پاس کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا نہ سڑکیں، نہ سواریاں نہ راہ چلتے لوگ بس حضرت عباس کا روضہ میرے سامنے تھا اور میں روئے جارہا تھا۔ سنہری گنبد پر لہراتا ہوا سرخ پرچم اور بلند و بالا مینار میرے سامنے تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ کربلا میں داخل ہونے والے ہر شخص پر آج بھی حسینؑ کا جاںنثار اور وفادار بھائی نظریں گڑائے ہے۔

ہم روضے کی پشت پر سے ہوتے ہوئے نہر فرات کے قریب ٹھیرے۔ میں دیر تک نہر فرات کو غور سے دیکھتا رہا۔ آج فرات کا پانی اس قابل نہیں ہے کہ اس کو بغیر صاف کئے ہوئے پیا جا سکے لیکن آج سے سو دو سو سال پہلے تک اس کا پانی اتنا شفاف تھا کہ نہر کے اندر کی زمین بھی دکھائی پڑتی تھی۔ فرات میں کچھ بچے نہا رہے تھے کچھ کناروں پر سے چھلانگ لگا رہے تھے اور میں رسول اللہ کے گھر کے ان بچوں کو یاد کر رہا تھا جو العطش کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ مجھے اس کی لہروں میں پیاسوں پر برستے ہوئے تیر نظر آرہے تھے۔ فرات تیزی سے رواں تھی

لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے فرات پر ایک عجب سی اداسی چھائی ہوئی لگ رہی تھی حالانکہ ہر روز لاکھوں آدمیوں کی پیاس یہی نہر بجھاتی ہے لیکن پانی کی ہر موج جیسے اپنا رنگ کھو چکی ہے میرا دل چاہا کہ فرات سے مکالمہ کروں اور پوچھوں کہ تجھے تو علقمہ نام کے بادشاہ نے سینکڑوں سال پہلے تعمیر کیا اس وقت سے لے کر اب تک نہ جانے کتنے کروڑ لوگوں کی پیاس بجھا چکی ہے تو ہی تو اس خطہ کی لائف لائین ہے تو ہی تو نہ جانے کتنی صدیوں سے اس خطہ کی آبیاری کر رہی ہے پھر بھی تو اس قدر اداس کیوں ہے؟ میں فرات سے ابھی سوال پوچھ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھ کو لگا کہ فرات نے ایک شعر کی شکل میں مجھے اپنا جواب عطا کیا

اب روز لاکھوں لوگ پئیں بھی تو مجھ کو کیا
میں جن کو چاہتی تھی وہ پانی نہ پی سکے

اس کے بعد ایک چھوٹے سے پل کو پار کر کے ہم سب فرات کے دوسرے کنارے پر پہنچے اور الضیاف نام کے ہوٹل میں داخل ہوئے لیکن ہوٹل میں جانے کے بعد معلوم ہو کہ یہاں ہم کو ہمارے میزبان غلطی سے لے آئے ہیں سامان گاڑیوں میں پھر چڑھا دیا گیا لیکن ہم سے کہا گیا کہ ہم لوگ لنچ اسی ہوٹل میں کریں گے۔ ہم لوگوں نے جلدی جلدی لنچ کیا اور اس کے بعد ہم دوسرے ہوٹل کے لئے روانہ ہو گئے۔ ویسے تو کربلا میں روضوں کے آس پاس کے علاقوں میں گاڑیاں آنے پر پابندی ہے لیکن ہماری کاروں کو خصوصی چھوٹ تھی اس لئے ہماری گاڑیاں زائرین کے ہجوم کے درمیان رینگتی ہوئی ہوٹل کی طرف جا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم امام حسین کے روضے سے تین سو میٹر کے فاصلے پر واقع ہوٹل الرایات میں پہنچ گئے۔ کربلا میں کوئی فائیو اسٹار ہوٹل نہیں ہے۔ ویسے بھی یہاں ٹھیرنے والے کسی بھی شخص کو ہوٹل میں ملنے والی سہولیات میں دلچسپی کم ہوتی ہے اور صرف اس بات پر ہر ایک کا دھیان مرکوز رہتا ہے کہ ہوٹل امام حسین اور حضرت عباس کے روضے سے کتنی دور پر واقع ہے۔ ہوٹل الرایات ایک تھری

اسٹار ہوٹل تھا لیکن اس کی خصوصیت یہ تھی کہ امام حسین کے روضے کے بے حد قریب تھا۔ کمرے اچھے اور آرام دہ تھے۔ ہم کو اور عین الحسن کو ایک کمرے میں ہی ٹھیرایا گیا تھا۔
جس پروگرام میں ہم لوگ مدعو تھے اس کی افتتاحی تقریب پانچ بجے تھی۔ ہم لوگوں کو سامان رکھتے رکھتے اور تیار ہونے میں کافی دیر ہو چکی تھی۔ بار بار ہمارے میزبان درخواست کر رہے تھے کہ ہم لوگ جلد از جلد افتتاحی تقریب میں پہنچ جائیں اور ہم لوگوں کو اس بات کی جلدی تھی کہ کسی طرح سے ہم سب اپنے آقا کے روضے پر پہنچ جائیں۔
ہم لوگوں نے جلدی جلدی کپڑے وغیرہ بدلے نہائے دھوئے کر امام حسین کے روضے کے لئے روانہ ہوئے جیسے ہی ہم ہوٹل سے نکل کر دس قدم آگے بڑھے وہاں جانچ کی چوکی نظر آئی لیکن ہم کو جانچ کے دائرے سے الگ رکھا گیا۔ اس چوکی کو پار کرتے ہی بائیں جانب امام حسین کا روضہ نظر آیا۔ ہوٹل کے موڑ سے روضے تک دو سو میٹر کی ایک راہداری تھی جس میں زمین کو پانی سے دھونے والی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ راستے کے بیچوں بیچ خوشنما فوارے چل رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ان فواروں کے پانی سے کھیل رہے تھے۔ کربلا کی سرزمین پر پانی کی آج کوئی کمی نہیں تھی۔ حسین کے چاہنے والوں نے کربلا کے ذرے ذرے کو سیراب کر دیا تھا لیکن پانی کی یہ فراوانی دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا اور کان میں امام کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی صدائے العطش آنے لگی۔ میرا دل کہنے لگا اے اللہ کیا یہی وہ پانی تھا جس کے لئے خاندان رسالت کے چھوٹے چھوٹے بچے ترس رہے تھے؟
اس راہداری کے ختم ہونے کے بعد ہم لوگ ذرا سا داہنی طرف مڑے تو تلہ الزینبی (وہ ٹیلہ جس پر کھڑے ہو کر امام حسین کی بہن حضرت زینب فریاد کر رہی تھیں) نظر آیا۔ مومنین اس کے باہر گریہ وزاری میں مصروف تھے۔ اب یہ ٹیلہ ایک شاندار عبادت گاہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

تین شعبان کا جشن

زینبی ٹیلے سے آگے بڑھے تو باب القبلہ نظر آیا جس کے سامنے ہی ایک بہت بڑی کشتی بنی ہے اس کشتی کو سفینۂ نجات کی علامت کے بطور یہاں بنایا گیا ہے۔ پانی میں تیرتی ہوئی اس کشتی پر آنحضور کی حدیث تحریر ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ ان کے اہل بیت کشتیٔ نوح کی مثل ہیں اور جو بھی ان سے تمسک اختیار کرے گا اس کو نجات مل جائے گی۔۔۔۔اور اچانک ہم اس در پر کھڑے تھے جہاں فرشتے اپنا سر جھکاتے ہیں۔ امام حسین کا روضہ ہمارے سامنے تھا۔ میں اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ سب حقیقت ہے۔

روضے میں زائرین کے اندر داخل ہونے کے لئے لوہے کی بیر کیڈ لگائے گئے تھے جس میں سے ہر شخص تلاشی کے بعد اندر جا رہا تھا لیکن ہم لوگ اس طرف سے داخل نہیں ہوئے کیوں کہ ہم سب مہمان تھے۔ ہم لوگوں کو بغیر تلاشی کے اندر جانے دیا گیا اس کی وجہ سے ہم لوگ اپنے موبائل فون بھی اندر لے جا سکے۔ جس کی وہاں قطعیٔ اجازت نہیں ہے۔

باب قبلہ سے امام حسین کی ضریح ایک دم سامنے نظر آتی ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے آقا کی دہلیز کو چوما اور اندر داخل ہوئے لیکن ہمارے میز بانوں نے کہا کہ ابھی ہم لوگوں کو ہال میں پہنچنا ہے ضریح کے پاس بھیڑ بہت ہے وہاں جانے میں دیر لگے گی اس لئے ہم نے دور سے ہی ضریح اقدس کو سلام کرنے کی سعادت حاصل کی اور سیدھے خاتم الانبیا ہال میں پہنچ گئے جہاں بے صبری سے ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ ہال باب القبلہ سے داخل ہونے کے بعد داہنی طرف پڑتا ہے۔ روضے کی فصیلوں پر بنا یہ ہال فرسٹ فلور پر واقع ہے۔ نہایت خوبصورت اور وسیع ہال کو بہت اچھے انداز سے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ عراق کے نائب وزیر اعظم اس موقع پر خصوصی

مہمان تھے۔ انھوں نے افتتاحی تقریر ہوئی، امام حسین کے روضے کی دیکھ بھال کرنے والی کمیٹی کے سربراہ آیت اللہ مہدی کربلائی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ کئی علما کی تقاریر ہوئیں کویت کے منسٹر فار انفارمیشن اور وہاں کے ممبر پارلیمنٹ سمیت مختلف لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اسی وقت منتظمین نے مجھے بتایا کہ مجھے اور عین الحسن کو سمینار کی افتتاحی تقریب میں ہی اپنے مقالات پیش کرنا ہیں۔ اپنا مقالہ میں ہوٹل میں چھوڑ آیا تھا اور واپس جا کر لانے کا وقت نہیں تھا کیوں کہ کسی وقت بھی ہمارا نام پکارا جا سکتا تھا۔ ہمارے لئے مترجم کا انتظام ہو چکا تھا مترجم سے میرا تعارف کروایا گیا۔ میں بہت پریشان تھا کہ کیا کروں کہ اچانک میرا نام پکار دیا گیا۔ میں نے لکھے ہوئے مقالے کے بجائے زبانی طور پر ہی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ میرے مقالے کا عنوان تھا ''امام حسین اور ہندوستان'' لیکن چوں کہ مقالہ میرے پاس نہیں تھا تو اس لئے جو کچھ مجھے یاد تھا وہ میں نے زبانی طور پر بیان کیا۔ میں نے اپنی بات اس جملے سے شروع کی کہ آپ لوگ کربلا میں رہتے ہیں اور کربلا ہمارے دل میں رہتی ہے۔ میں نے ہندوستان میں عزاداری کے بارے میں کچھ دلچسپ حقائق پیش کئے حاضرین سے کھچا کھچ بھرے ہال میں پیش کئے۔ میں نے اہل عراق کو بتایا کہ ہندوستان کا شائد ہی کوئی شہر ایسا ہو جہاں کربلا نام کی کوئی عمارت موجود نہ ہو۔ لکھنؤ جیسے شہر میں تو کربلا نام کی بیس پچیس تاریخی عمارتیں ہیں۔ میں نے جلسہ میں کہا کہ ہندوستان کے طول عرض میں جتنے حسینیہ (امام باڑے ہیں) دنیا کے دوسرے کسی ملک میں نہیں ہوں گے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ کئی ایسی عمارتیں بھی ہیں جو ہندو عقیدت مندوں نے امام حسین کی یاد میں بنوائی ہیں۔ یہ سب اطلاعات اہل عراق کے لئے حیران کن تھیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہند و عراق کے عوام کے مابین روابط تقریباً ختم ہو گئے ہیں اس لئے دونوں ممالک کی موجودہ نسلیں ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتی ہیں۔ میرے بعد پروفیسر عین الحسن نے تقریر کی اور ہندوستان کے ہندو

شعرا کے کئی اشعار کی روشنی میں یہ بتایا کہ ہندوستان کے غیر مسلم افراد امام حسین سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔

جلسہ کے بعد ہم لوگوں کو امام حسین کے روضے میں ہی بنائے گئے اس ہال میں لے جایا گیا جہاں زائرین کے لئے کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ یہاں کھانا ایک دم فری ہوتا ہے لیکن اس کے لئے زائرین کو عتبہ کے ذمہ داروں سے ٹوکن حاصل کرنا ہوتے ہیں۔ اس جگہ کو ضیوف یعنی مہمان گاہ کہا جاتا ہے۔ مجھے یہاں کے ذمہ داروں نے بتایا کہ صدام حسین کے زمانے میں روضے کے اندر کسی قسم کے نعرے لگانے کی ممانعت تھی محمد وآل محمد پر درود بھیجنے کو بھی ایک قابل سزا جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس ہال میں ان لوگوں کو قید کر کے اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں جو با آواز بلند صلواۃ بھیجنے کی ہمت کرتے تھے۔ ضیوف میں جو کھانا ہم لوگوں کو ملا وہ مرچ مصالحہ سے بالکل عاری تھا اس لئے ہمارے میزبان سعد الدین ہاشم نے ہم سب کے لئے ہری مرچیں اور پسی ہوئی لال مرچیں منگوائی جو وہاں ہندوستان اور پاکستان کے زائرین کی عادتوں کا خیال رکھنے کی غرض سے شائد رکھی گئی ہیں۔ کھانے کے بعد ہم لوگ باہر نکلے اور امام کی ضریح کی زیارت کے لئے بڑھے۔ ضریح پر جانے سے قبل زیارت کی کتابیں اٹھائیں اور زیارت پڑھی اور اس کے بعد دیوانہ وار اس اندرونی ہال میں داخل ہوئے جہاں امام کی قبر ہے۔ کچھ یاد نہیں کہ ہم کس طرح اندر پہنچے نہ یہ معلوم پڑا کہ کتنی بھیڑ تھی جس میں سے ہم گزرے۔ صرف صلواۃ کی آوازیں ہم کو سنائی پڑ رہی تھیں اور آنسوؤں میں ڈوبا ہوا منظر چاروں طرف تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کس طرح میں ضریح اقدس تک پہنچ گیا اور امام حسین کے روضے کی جالیوں کو پکڑ کر اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا۔ کافی دیر میں امام کی ضریح سے لپٹ کر روتا رہا اور ان کا شکر یہ ادا کرتا رہا کہ مجھ جیسے گناہ گار اور خطا کر بندے کے گناہوں کو معاف کر کے انھوں نے یہ سعادت بخشی کہ اپنے روضہ پر بلا لیا۔ میں بس یہی سوچ رہا تھا کہ کس قدر خوش بختی تھی ہم سب کی کہ ہم امام

حسین کے یوم ولادت کے موقع پر کربلا میں موجود تھے۔ آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں میں خوشی کے لاکھوں دیئے روشن تھے اور شکرانے کے ہزاروں چراغ جل رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ سعادت بخشی کہ ہم آج کے دن امام حسین کے روضے پر موجود تھے۔

بھیڑ بھاڑ میں مجھ کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ آغا سلطان، ان کے والد، ڈاکٹر رضا اور عین الحسن کہاں ہیں۔ اپنے امام کے روضے کی زیارت کر کے میں باہر نکلنے لگا تو حضرت حبیب ابن مظاہر کی ضریح کو بوسہ دیا۔ حضرت عباس اور امام حسین کے علاوہ حضرت حبیب ابن مظاہر ہی کربلا کے شہیدوں میں صرف ایک ایسے شہید ہیں جن کی ضریح الگ سے نظر آتی ہے۔ شائد اللہ نے یہ افتخار حضرت حبیب کو اس لئے عطا کیا کہ وہ امام حسین کے بچپن کے دوست تھے اور دوسری بات یہ ہے انھوں نے کربلا پہنچتے ہی حضرت زینب کو حضرت فضہ کی معرفت سلام کہلوایا تھا اور اللہ کو ان کی یہ ادا اس قدر بھا گئی کہ اب قیامت تک حسین پر سلام بھیجنے والا ہر زائر بغیر حبیب کے روضے کو سلام کئے ہوئے واپس نہیں آئے گا۔ ان کی قبر مبارک کے بالکل قریب میں وہ جگہہ محفوظ ہے جس کو قتل گاہ کہا جاتا ہے اور وہ پتھر بھی ہے جہاں امام حسین کا سر کاٹ کر رکھا گیا تھا۔ جب کہ روضے کہ اندر داہنی طرف گنج شہیداں ہے جس میں تمام شہدائے کربلا کی اجتماعی قبر ہے۔ امام حسین کی قبر کے پہلو میں ان کے شیر خوار کی قبر ہے جب کہ پاؤں کی جانب ان کے نوجوان فرزند اور شبیہ رسول حضرت علی اکبر کی قبر ہے۔ اسی طرف کا حصہ خواتین کے لئے مخصوص ہے۔ خواتین کی جانب سے گریہ کی ایسی آوازیں آ رہی تھیں کہ دل پھٹا جاتا تھا۔ مومنات اس طرح اپنے آقا کو یاد کر رہی تھیں کہ جیسے آج ہی کسی گھر میں کسی جوان کی موت وہ گئی ہو۔ مردوں والے علاقہ میں صلواتوں کا سلسلہ جاری تھا اور آنسوؤں کا سیلاب ہر آنکھ میں دکھائی دے رہا تھا۔ ضریح کے آس پاس جس کو جگہہ مل رہی تھی وہ نماز زیارت پڑھنے میں مشغول تھا۔ میں نے بھی نماز زیارت پڑھی اور تمام شہدائے کربلا کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا

اور ضریح والے ہال سے باہر نکلا تو دیکھا کہ باہر مومنین کی جانب سے جگہ جگہ محفلیں ہو رہی ہیں۔ ایک طرف بوہرہ حضرات کا ایک گروہ مدح خوانی میں مصروف تھا تو دوسری طرف ایرانیوں کا ہجوم تھا جو امام حسین کی یاد میں منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کر رہا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر پاکستان کے زائرین کا ایک گروہ مدح امام میں مصروف تھا۔ پاکستان کے ایک معروف مدح خواں شادمان رضوی مدحت امام میں مصروف تھے۔ حرم امام حسین کے اندر ہی ہمارے ساتھ بھی مل گئے۔ ہم لوگ بھی کچھ دیر اس محفل میں بیٹھے اور منقبتی اشعار سنتے رہے۔ امام کی ضریح کے باہر کا ہال بہت وسیع وعریض ہے۔ اسی میں پانچوں وقت کی نماز جماعت بھی ہوتی ہے۔ چوں کہ شیعہ فقہ کے مطابق اگر بیچ سے صف ٹوٹ جائے تو نماز جماعت ادا نہیں ہوتی۔ اسلئے یہاں ایک ہی ہال میں تین تین جگہ پر نماز جماعت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باب القبلہ کی طرف سے آنے والی راہداری ہمیشہ کھلی رہتی ہے اور لوگ نماز کے دوران بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ جن کو جگہ نہیں ملتی وہ اسی راہداری سے یا پھر زینبی ٹیلہ کی سمت سے باہر چلے جاتے ہیں۔ صفیں ان ہی دروازوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہیں اور ایک ہی جگہ پر تین تین امام جماعت کی امامت کرتے ہیں۔ یہ ہال فن تعمیر کا نہایت خوبصورت نمونہ ہیں۔ چھت پر بہت حسین جھاڑ لٹک رہے ہیں۔ ماشا اللہ عوام کی جانب سے چڑھائے جانے والی رقومات کے درست استعمال سے روضے میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ پورا روضہ ائیر کنڈیشنڈ ہے بجلی کا بہترین انتظام ہے۔ بجلی جاتے ہی جنریٹر فوری طور پر کام کرنے لگتا ہے۔ میں نے زائرین کی زبانی سنا ہے کہ چار پانچ سال پہلے یہاں کی حالت اس قدر بری تھی کہ بجلی بار بار جاتی تھی لیکن اتنا بڑا جنریٹر نہیں تھا جو اس وسیع وعریض ہال کے لئے کافی ہو۔ کویت پر حملے کے بعد سے پورے عراق میں بجلی کی سخت پریشانی ہے کیوں کہ امریکیوں نے جتنے بھی بجلی گھر تھے سب کو تباہ وبرباد کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے روضوں میں بھی مومنین کو سخت پریشانی کا سامنا تھا۔ عراق

کی شدید گرمی میں بغیر بجلی کے ایک بڑے ہجوم کا کہیں موجود ہونا بہت سخت مسئلہ تھا۔ اس لئے اس زمانے میں کربلا کی مینجمنٹ کمیٹی کی جانب سے لگاتار یہ کوشش ہو رہی تھی کہ مومنین ہندوستان کی طرف سے ایک بڑا جنریٹر بھیج دیا جائے لیکن کمیٹی کی طرف سے کہا جا رہا تھا کہ اس سلسلے میں عوامی طور پر کوئی اپیل جاری نہ کی جائے ورنہ لوگوں کو کھانے کمانے کا دھندہ مل جائے گا۔ منتظمہ کمیٹی حکومت ایران سے بھی مدد کی درخواست نہیں کر رہی تھی ورنہ ایک پل میں یہ انتظام ہو جاتا۔ وہ چاہتے تھے خاموشی سے کوئی مومن یہ کام کر دے۔

آغا سلطان کے سامنے بھی جب یہ ذکر آیا تو انھوں نے ہندوستان کے کچھ ایسے دولت مند شیعوں سے بات کی جن کو خدا نے اتنی دولت دی ہے کہ وہ ایک کروڑ کی قیمت والا جنریٹر خرید کر بھیج سکتے تھے۔ شروع شروع میں ایک صاحب نے کافی دلچسپی لی اور لگتا تھا بات بن جائے گی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ گروہ بندی کا شکار ہو گئے اور پیچھے ہٹ گئے۔ ایک اور دولت مند شیعہ نے کہا کہ وہ اکیلے ہی جنریٹر لگوا دیں گے لیکن انھوں نے یہ شرط لگا دی کہ جنریٹر پر ان کے مرحوم والد کے ایصال ثواب کی تختی لگی ہوگی۔ روضوں کی منتظمہ کمیٹی نے اس شرط کو یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ امام حسین کے زائرین کو سہولیات پہنچانے کے لئے جو کچھ کرتے ہیں اس میں کسی قسم کی شرط نہیں لگائی جا سکتی۔ اس طرح یہ سعادت ہندوستان کے کسی شخص کو نہیں ملی بلکہ کسی دوسرے ملک کو یہ سعادت ملی۔

تھوڑی دیر بعد ہم لوگ روضے سے باہر نکلے تو بڑا ایمان افروز منظر تھا۔ کربلا کی گلیوں میں تین شعبان کا جشن منایا جا رہا تھا۔ پورے کربلا میں جھنڈیاں لگی تھیں، سرخ پرچم لہرا رہے تھے، قمقمے روشن تھے اور عوام کی طرف سے جلوس نکالے جا رہے تھے جن میں شامل بچے جوان، خواتین اور بزرگ عربی کے روائتی گیت گا رہے تھے۔ جلوسوں میں شامل لوگوں نے اپنے ہاتھ میں شمعیں بھی اٹھا رکھی تھیں۔ یہاں کے روضوں میں شمع اگربتی جلانے کی بالکل اجازت

نہیں ہے۔ پھر بھی کئی جگہ فٹ پاتھوں پر خواتین شمعیں روشن کئے بیٹھی تھیں۔ یہ سارے جلوس
امام حسین کے روضے سے ہوتے ہوئے حضرت عباس کے روضے پر ختم ہو رہے تھے۔ رات
بھر جلوسوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ کئی جگہوں پر مختلف موکبوں نے سبیلیں لگائیں تھیں۔ جہاں کھانا،
پانی، شربت اور بغیر دودھ کی چائے تقسیم ہو رہی تھی۔ ہر سبیل پر لوگوں کو ہجوم تھا۔

ہم لوگ اسی بھیڑ میں سے ہوتے ہوئے حضرت عباس کے روضے کی طرف بڑھے۔ دونوں
روضوں کے درمیان ایک وسیع وعریض میدان ہے جس کو بین الحرمین کہا جاتا ہے۔ اسی میدان
میں ہزاروں بچے، عورتیں، مرد، اور معذور افراد مقیم تھے۔ ان کو اس میدان میں آرام پہنچانے
کے لئے منتظمہ کمیٹی کے زیر اہتمام چلنے والے مرکز مفقودین کی جانب سے قالین، گدوں اور
تکیوں کا انتظام کیا گیا تھا، گو کہ رات کافی گزر چکی تھی لیکن گرمی اپنے شباب پر تھی اور لو کے جھکڑ
زائرین کی محبتوں کا امتحان لے رہے تھے۔ عراق میں گرمی کا عالم یہ تھا کہ دن میں درجۂ
حرارت 52 ڈگری سیلسئس تک پہنچ جاتا تھا اور رات میں درجۂ حرارت پینتالیس ڈگری تک
رہتا تھا۔ شدید گرمی میں کھلے آسمان کے نیچے جابجا بیٹھے ہوئے ان زائرین کے چہروں پر نہ تو
تکلیف کے آثار تھے اور اور نہ کرب کی کوئی لکیر۔۔ ہر چہرہ پر اطمینان اور شکرانے کے
آثار تھے کہ وہ اپنے امام کی بارگاہ میں آج کی اہم رات میں حاضر ہو سکے۔ ان زائرین کے
مطمئن چہروں کو دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ اصل زائر تو یہی ہیں جو سخت گرمی اور خون پھونک
دینے والی لو کے درمیان اس قدر خلوص وعقیدت کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ ہم تو ایک ایئر
کنڈیشنڈ کمرے میں تھے ہم کو کہاں اندازہ تھا کہ ان لوگوں کو کس قدر سخت موسم کا سامنا ہے؟
بہر حال ان لوگوں کو راحت پہنچانے کے لئے دونوں روضوں کی منتظمہ کمیٹیوں نے بہت
اچھے انتظامات کئے تھے۔ ٹھنڈا پانی فراوانی کے ساتھ موجود تھا۔ ہر جگہ پر ٹھنڈے پانی سے
بھرے کول جگ رکھے تھے۔ مجھے سقائے سکینہ کے روضے کے قریب پانی کی یہ فراوانی بہت

اچھی لگی۔ اللہ کا شکر کہ حضرت عباس کے صدقے میں یہاں پانی کا ایسا انتظام ہو گیا ہے کہ اب
تا قیامت کوئی بچہ یہاں صدائے العطش بلند نہیں کرے گا۔

امام حسین کے روضے سے حضرت عباس کے روضے تک پہنچنے میں ہم کو کافی وقت لگا کیوں کہ
بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ کربلا کے مقامی نوجوان تو تالیاں بجاتے اور اچھلتے کودتے ہوئے آرہے
تھے لیکن کئی ایرانی انجمنیں نوحہ خوانی کرتی ہوئی بھی آرہی تھیں۔ یہ دو ثقافتوں کا فرق واضح طور
پر نظر آرہا تھا۔ عین الحسن اور میں اسی راستے سے ہوتے ہوئے حضرت عباس کے روضے پر
پہنچے۔ ان کے روضے پر بہت بڑے بڑے الفاظ میں یا سقائے عطاش کربلا تحریر ہے۔ یہ
جملہ میں نے پہلی بار سنا تھا کیوں کہ ہندوستان میں اس کا استعمال نہیں ہوتا ہے ہند میں حضرت
عباس کو سقائے سکینہ کہہ کر یاد کیا جاتا ہے مجھکو یہ نام بہت اچھا لگا۔

حضرت عباس کے روضے پر دو نئے مینار تعمیر کئے گئے ہیں جن پر اس وقت غلاف چڑھے
ہوئے تھے۔ کیوں کہ ان کا افتتاح دوسرے دن ہونا تھا۔ روضے پر بہت بھیڑ تھی لیکن ہم لوگ
اس خاص دروازے سے داخل ہو گئے جو مہمانوں کے داخلے کے لئے وقف تھا۔ ہم کو اندر
جانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی نہ ہی موبائل جمع کروانا پڑا۔ روضے کے اندر ہر طرف سقائے
سکینہ کے چاہنے والوں کا ایک ہجوم ان کو یاد کرنے میں محو تھا۔ نہ جانے کتنے ممالک اور نہ جانے
کتنی اقوام کے لوگ یہاں موجود تھے لیکن سب کے ہونٹوں پر ایک ہی نعرہ تھا یا عباس یا عباس
۔ اور اسی بھیڑ میں یہ گناہ گار بندہ بھی حیراں کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی جگہ ہے جہاں کم
سے کم ایک بار جانے کا خواب ہر شیعہ مسلمان کی آنکھوں میں موجود ہوتا ہے؟ حضرت عباس
کے روضے کی چہار دیواری کے اندر (ضریح والے ہال اور اس کے آس پاس کے حصوں کے
علاوہ) ابھی تک چھت نہیں ہے لوگ کھلے آسمان میں نماز پڑھتے ہیں اور جب دھوپ نہیں ہوتی
ہے آرام بھی کرتے ہیں۔ یہاں کے صحن میں بڑے بڑے پنکھے لگے ہیں جن سے ہوا کے ساتھ

پانی کی ہلکی ہلکی پھوار بھی نکلتی ہے ان پنکھوں کو Mist fan اور واٹر اسپرنکلر فین کہا جاتا ہے۔
یہ پنکھے کھلے میدانوں یا صحن میں لگائے جاتے ہیں جہاں اے سی لگنا ممکن نہیں ہوتا ہے ان کی
بھیگی ہوئی ہوا لوگوں کو لو کے جھکڑوں کے دوران بہت راحت پہنچاتی ہے۔

مجمع کے درمیان سے ہوتے ہوئے ہم لوگ ضریح کے پاس پہنچے۔ زیارت حضرت عباس
پڑھنے والوں کا ایک ہجوم ضریح کے باہر والے دروازے پر موجود تھا۔ ضریح کے باہر والے
دروازے کے پاس ہی سینکڑوں چھوٹی چھوٹی کتابیں وہاں رکھی تھیں جن میں حضرت ام البنین
اور حضرت عباس کی زیارت تحریر تھی۔ ہم سب نے بھی زیارت کی کتابیں اٹھائیں اور
زیارت پڑھی پھر اندر داخل ہوئے تو فرط مسرت سے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میں زور زور
سے یا عباس یا عباس کہتا ہوا ضریح والے ہال میں داخل ہوا۔ میں اپنے مولا کا شکریہ ادا کرنے
کے لئے آنسوؤں کا نذرانہ ان کی خدمت میں پیش کر رہا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں کیسے ضریح
تک پہنچا اور کیسے بوسہ دینے کی سعادت حاصل کر سکا سارا منظر اشکوں میں غرق تھا۔ ہاں مجھے
اتنا ضرور یاد ہے کہ میں کافی دیر تک ضریح کو پکڑے ہوئے کھڑا رہا اور اپنے مولا کی بارگاہ میں
دعا کرتا رہا۔ پھر میں نے اپنے جیب سے قلم نکالا اور اپنے آقا کی ضریح سے اس کو مس کرتے
ہوئے یہ دعا کی کہ یہ قلم کبھی ظالموں کی طرف داری نہ کرے اور کبھی مظلوم سے غداری نہ
کرے۔ میں نے دعا کی کہ اے مولا میرے اس قلم کو اپنے حفظ وامان میں رکھئے گا تا کہ کبھی
اس کو کوئی امیر خرید نہ سکے۔

ضریح کو بوسہ دینے کے بعد زیارت حضرت عباس اور ان کی جرار والدہ حضرت ام البنین کی
زیارت کی نماز پڑھی۔ پھر باہر نکلے اور روضے کو چاروں طرف سے دیکھنے کے لئے صحن کے
اندر گھومنے لگے تو روضے کی پشت پر ایرانی زائرین کے ایک گروہ کو ایرانی ذاکر خطاب کر رہا
ہے۔ چوں کہ میں فارسی سمجھ لیتا ہوں اور عین الحسن تو فارسی کے پروفیسر ہی ہیں اس لئے ہم

دونوں اس مجلس میں بیٹھ گئے۔ اس ذاکر نے اس قدر پر اثر انداز میں حضرت عباس اور ان کی
قربانی کا ذکر کیا کہ تمام زائرین روتے روتے بے حال ہو گئے۔ ہم لوگ اس مجلس میں بیٹھ کر
خوب روئے اور اپنے مولا کی مظلومی کا ذکر اتنے بہتر انداز میں کرنے والے ذاکر کو دعائیں
دیتے رہے۔ روضے کے اندر مسلسل چھوٹے چھوٹے بچے اور خواتین تبرک کے بطور مٹھائیاں
بانٹتے پھر رہے تھے۔

رات کافی ہو چکی تھی یہاں کے وقت کے حساب سے رات کے بارہ بجے تھے لیکن ہماری
ہندوستانی گھڑیوں میں ڈھائی بجے تھے۔ ہم لوگ اس مجلس کے بعد باہر نکلے۔ اس وقت
مناسب ہوگا کہ اگر میں بتا دوں کہ امام حسین اور حضرت عباس کے روضوں کے چاروں تک
ایک چوڑی سڑک ہے۔ سڑک کے پار تین منزلہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ سب ہی بلڈنگیں لائم
اسٹون کے رنگ کی ہیں۔ ان بلڈنگوں میں گراؤنڈ فلور پر دوکانیں ہیں اور باقی کی منزلوں پر
ہوٹل اور مہمان خانے ہیں۔ روضوں کے چاروں طرف جو دوکانیں ہیں ان میں زیادہ تر سلے
سلائے کپڑے، عبا، اسکارف، کھلونے، مٹھائیاں اور گفٹ آئٹم بیچنے والے دکھائی پڑتے
ہیں۔ اس کے علاوہ تسبیح وسجدہ گاہ اور کفن بیچنے والوں کی بھی لاتعداد دوکانیں یہاں موجود ہیں۔
کربلا دنیا کا وہ واحد شہر ہے جہاں کی مٹی خرید کر اپنے گھر لے جانا ااور وہاں اپنے دوستوں اور
عزیزوں کو تقسیم کرنا ایک سعادت کی بات سمجھی جاتی ہے۔ امام حسین کے خون کا ہی یہ اثر ہے کہ
کربلا کی مٹی کو خاک شفا کا درجہ ملا ہے۔ امام جعفر صادق نے فرمایا ہے کہ امام حسین کی قبر کے
چاروں طرح پانچ فرسخ یعنی تقریباً 30 کلومیٹر کے علاقہ میں پائی جانے والی مٹی کو خاک شفا
قرار دیا گیا ہے۔ اس مٹی پر سجدہ کرنے اور اور مرنے کے بعد اس کو قبر میں رکھے جانے کی تمنا ہر
شیعہ کرتا ہے اسی لئے خاک شفا کی سجدہ گاہیں اور تسبیحیں بنانے والی ایک انڈسٹری کربلا میں
ڈیولپ ہوگئی۔ یہ بھی اللہ کی ایک عطائے خاص ہے کہ آج دنیا کے ہر کونے میں آپ کو خاک

کربلا ضرور مل جائے گی۔ کیوں کہ دنیا کا کوئی بھی ملک کیوں نہ ہو وہاں ایک نہ ایک شیعہ ضرور موجود ہوگا اوراس کے گھر میں آپ کو خاک شفا کی سجدہ گاہ ضرور مل جائے گی۔

یہ بھی دیکھ کر عام آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ کربلا دنیا کا ایک ایسا واحد شہر ہے جہاں کفن بیچنے والوں کی لاتعداد دکانیں ہیں۔ حالانکہ لوگ جب سفر پر جاتے ہیں تو موت کا تذکرہ اس لئے نہیں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی بدشگونی نہ ہو جائے لیکن یہ صرف زمین کرب و بلا کا اعجاز ہے کہ یہاں آنے والا ہر شخص اپنے لئے اور اپنے چاہنے والوں کے لئے نہایت خضوع وخشوع سے کفن خریدتا ہے۔ ظاہر ہے کفن ایک ایسی حقیقت ہے جس سے دنیا کا کوئی شخص نہیں بچ سکتا اس لئے اس کی خریداری کرنا حقیقت پسندی کا ثبوت ہے۔ ہندوستان سے کربلا جانے والے ہر شخص سے اس کے عزیز و رشتے دار یہی فرمائش کرتے ہیں کہ وہاں سے کفن لیتے آنا۔ اصل میں امام حسین کی قربانی نے شیعوں کے لئے موت کو آسان بنادیا ہے۔

حضرت عباس کے روضے سے نکلے تب بھی کافی بھیڑ تھی سڑکوں پر ویسی ہی چہل پہل تھی جیسی کہ سرشام تھی۔ گو کہ دکانیں بند ہو چکی تھیں لیکن عوام کے گروہ جوق در جوق روضے کی طرف آ رہے تھے اور واپس جا رہے تھے، روضوں کے چاروں طرف پولس کی گاڑیوں کے علاوہ کسی قسم کی گاڑیوں کی آمدورفت کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ روضوں کی منتظمہ کمیٹی کی جانب سے روضوں کے چاروں طرف بزرگوں کے لئے بیٹری سے چلنے والی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں چلتی ہیں جن میں سفر کرنے والوں سے کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا ان گاڑیوں کے ذریعہ خواتین اور بزرگ مرد اپنے ہوٹلوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ہاتھ کے ٹھیلے بھی چلتے ہیں جن کو ویسے تو سامان اٹھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن ان میں عورتیں اور بچے سفر بھی کرتے ہیں ان ٹھیلوں کو افغانہ کہا جاتا ہے۔

کافی رات گزر جانے کے بعد بھی ہوٹل، چائے خانے اور مٹھائی کی دکانیں کھلی تھیں اور ہر دکان

پر گاہکوں کی بھیڑ تھی دونوں روضوں کی طرف جانے والے سب ہی راستوں کی فٹ پاتھ پر قالین بچھا دئے گئے تھے تاکہ جس کو جہاں جگہ ملے وہ وہاں بیٹھ جائے اور آرام کرے۔ کہیں کہیں راستے میں گفٹ آئیٹم، سبز رنگ کے بینر اور کپڑے کی پٹیاں بیچنے والے نوجوان بھی کھڑے تھے۔ بچوں کی دلجوئی کے لئے غبارے اور کھلونے بیچنے والے بھی موجود تھے۔

روضے کے آس پاس صفائی کرنے والوں اور جاروب کش لوگ مسلسل کام میں مصروف تھے کہیں پر بھی کوڑے کا نام نہ تھا۔ سڑکیں چمچما رہی تھیں۔ مجھے یہاں کے صفائی کے انتظامات دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی تھی کیوں کہ ہندوستان میں عام طور پر مسلمانوں کی عبادت گاہوں کے آس پاس گندگی کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ پورے علاقہ میں ایک عجیب سی بھینی بھینی خوشبو تھی جس سے دماغ معطر تھا۔

ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ کہیں فقیر، گدا، بھکاری اور بھیک مانگنے والے لوگ نظر نہیں آرہے تھے۔ دعا تعویذ اور گنڈے کا کاروبار کرنے والوں کی کوئی دکان یہاں موجود نہیں تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر اچھا لگا کہ یہاں کے لوگوں نے اللہ تک پہنچنے کے لئے اہل بیت کو وسیلہ بنایا ہے اور اہل بیت تک پہنچنے کے لئے کسی رمال، عامل یا تانترک کو نہیں اپنی عقیدت کو وسیلہ بنایا۔ اگر بتی اور شمع بیچنے والوں کی چیخ و پکار سے بھی یہ علاقہ محفوظ تھا۔ پھولوں کے سہرے بیچنے والے بھی یہاں ندارد تھے۔ جب کہ ہمارے ملک میں ان سب دکانوں کے بغیر عبادت گاہ تو عبادت گاہ لگتی ہی نہیں ہیں۔

حضرت عباس کے روضے کے باہر ایک بڑی سی مشک آویزاں ہے۔ جس میں سے ہر وقت پانی جاری رہتا ہے۔ یہ یادگار اصل میں حضرت عباس کے کرم کی ایک علامت ہے۔ اس مشک کو دیکھ کر لگتا ہے کہ حضرت ابوالفضل العباس کی مشک ساری دنیا کے مظلوموں کی پیاس آج بھی بجھا رہی ہے۔

اس مشک کے کچھ دور کے فاصلے پر ایک گلی کے موڑ پر وہ جگہ ہے جہاں حضرت عباس کا پہلا ہاتھ قطع ہوا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ جگہ موجود ہے جہاں حضرت کا دوسرا ہاتھ کاٹا گیا تھا۔ان گلیوں کے اندر بھی دوکانیں ہیں جہاں زائرین اپنے اہل وعیال کے لئے سوغاتیں خریدتے ہیں۔ اتنی رات گئے کربلا میں اس قدر چہل پہل دیکھ کر مجھے لگا کہ کربلا کبھی سوتی نہیں، وہ سرزمین سوبھی کیسے سکتی ہے جس کا نگہبان ایک ایسا غازی ہو جو چودہ سو برس سے حسین کی نگہبانی میں مصروف ہے۔ہم لوگ عوام کی بھیڑ میں سے ہوتے ہوئے واپس ہوئے تو پھر امام حسین کا روضہ ہمارے سامنے تھا۔اس سے تھوڑا سا آگے بڑھے تو اس ٹیلے کی زیارت کی جس پر چڑھ کر جناب زینب عاشور کے دن پسر سعد سے اپنے بھائی حسین ابن علی کے قتل سے باز رہنے کے لئے کہہ رہی تھیں۔

اب یہ ٹیلہ ایک بڑی زیارت گاہ میں تبدیل ہو گیا ہے لیکن چوں کہ یہاں جگہ بہت کم ہے اس لئے مومنین کو اندر آنے اور جانے میں کافی دقت ہوتی ہے اور وہاں نماز زیارت ادا کرنے کے لئے کافی دیر تک جگہ حاصل کرنے کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہے۔رات کو بھی یہاں بے انتہا بھیڑ تھی۔امام حسین کے روضے کا ایک دروازہ اس طرف بھی کھلتا ہے اگر یہ جگہ کھلی ہوئی ہوتی تو قتل گاہ کا منظر یہاں سے نظر آجاتا۔

مزید آگے بڑھنے سے پہلے مناسب یہ ہوگا کہ کربلا میں امام حسین کے روضے کی تعمیر اور اس پر ہوئے حملوں کی بات کر لی جائے۔

روضۂ حسین کی تاریخ

صرف ساٹھ سال پہلے اللہ کے رسول نے دنیا کے جس عظیم ترین اور بہترین مذہب کے دنیا میں اترنے کا علان کیا تھا وہ عرب کی حدوں کو پار کر کے عراق، مصر، افریقہ اور ایران تک پھیل چکا تھا لیکن رسول کی وفات کو ابھی چار صدیاں بھی پوری نہیں ہوئی تھیں کہ ان ہی کے خانودے پر نام نہاد مسلمانوں نے دنیا تنگ کر دی تھی۔ رسول کے سب چہیتے نواسے حضرت حسین کو پہلے مدینہ چھوڑنا پڑا اور بعد میں مکہ چھوڑ کر عراق کی جانب سفر کرنا پڑا۔رسول کی ہجرت کے اکسٹھ سال بعد جب نیا ہجری سال شروع ہو رہا تھا تو رسول کا محترم نواسہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ عراق کے تپتے ریگستانوں میں محوسفر تھا۔محرم الحرام کی دو تاریخ آگئی۔ یہ قافلہ ایک مقام پر قیام پذیر ہوا۔امام حسین نے وہاں کے لوگوں سے اس جگہ کا نام پوچھا کسی نے کہا اس کو غاز ریہ کہتے ہیں کسی نے کہا اس کو نینوا کہتے ہیں کسی نے کہا یہ علاقہ شط الفرات کے نام سے مشہور ہے تو کسی بزرگ نے ہاتھ جوڑ کر کہا مولا اس کو کربلا بھی کہتے ہیں۔ یہ نام امام حسین کے لئے نیا نہیں تھا بچپن سے وہ اس کے بارے میں سنتے آئے تھے۔روایتوں کے مطابق امام حسین کی ولادت کے وقت ہی ہمارے رسول کو جبرئیل امین نے یہ بتا دیا تھا کہ رسول کا یہی وہ نواسہ ہے جس کو بنی امیہ کے ظالم و جابر شہید کریں گے۔یعنی رسول کریم جانتے تھے کہ پیام الٰہی پھیلانے کے صلہ میں ان کی اولاد کو ہی تہہ تیغ کیا جائے لیکن ہمارے مظلوم رسول نے سب کچھ جاننے کے باوجود کار رسالت میں ایک رتی بھر کمی نہ آنے دی اور اپنے خانوادے کی قربانیوں پر نازاں رہے اور اپنے رب کا شکر ادا کرتے رہے کہ اس نے انسانیت کو بچانے کے لئے ان کے خانوادے کو قربانیوں کے لئے منتخب کیا۔

امام حسین نے جب کربلا کا نام سنا تو انھوں نے کہا واللہ یہی وہ زمین ہے جہاں ہمارا خون بہایا

جائے گا۔ جہاں ہمارے بچوں کو تہہ تیغ کیا جائے گا اور یہیں ہماری قبریں بنیں گی۔

عراق کے کربلا نام کے جس علاقے میں (جو بغداد سے تقریباً سو کلومیٹر اور کوفے سے تقریباً نوے کلہ میٹر کے فاصلے پر واقع ہے) امام حسین کی شہادت دس محرم سن 61 ہجری مطابق 10 اکتوبر 680 عیسوی کو ہوئی تھی وہاں اس زمانے میں کوئی بڑی آبادی نہیں تھی صرف بنی اسد نام کا ایک قبیلہ وہاں آباد تھا۔ جب امام حسین وہاں پہنچے تھے تو انھوں نے اس علاقے کی زمین قبیلۂ بنی اسد سے خرید لی اور بعد میں ان کو یہ زمین یہ کہہ کر ہبہ کر دی تھی کہ ان کی شہادت کے بعد ان کی، ان کے عزیزوں اور ساتھیوں کی جو قبریں بنیں وہ ان کی دیکھ بھال کریں۔

جب امام حسین اور ان کے ساتھی، دوست، اقربا اور جگر کے ٹکڑے شہید ہو گئے تو بنی اسد نے ان کی قبریں امام زین العابدین کی نگرانی میں تیار کیں اور بعد میں ان قبروں کی دیکھ ریکھ کا کام انجام دیا۔ بنی اسد نے جو قبریں بنائیں ان میں حضرت امام حسین اور ان کے منجھلے بیٹے (جن کو اب ہم سب حضرت علی اکبر کہتے ہیں) اور ان کے شیر خوار بیٹے حضرت علی اصغر کی قبریں امام کے پہلو میں بنائیں اس کے علاوہ امام کی قبر کے پائتیں دیگر شہدائے کربلا کی اجتماعی قبر بنائی۔

صرف امام کے بچپن کے دوست حضرت حبیب ابن مظاہر کی قبر اجتماعی قبر سے الگ بنائی گئی۔

تاریخی حوالوں سے ملتا ہے کہ بنی اسد نے امام حسین کی قبر پر کھجور کی چٹائی سے بنا ایک شامیانہ نصب کیا اور ایک بیری کا درخت بھی لگایا۔ قبر مبارک پر شمع جلانے کا کام بنی اسد کے ایک بزرگ شیخ کو سونپا گیا تھا۔

امام حسین کے ایک چاہنے وال اور جانثار حضرت مختار ابن ابوعبیدہ ثقفی نے جب انتقام خون حسین کے نعرے کے ساتھ خروج کیا تو انھوں نے جلد ہی کوفے پر قبضہ کر لیا حکمرانی کا موقع ملتے ہی اس انقلابی فوجی جنرل نے 684 عیسوی میں کربلا میں امام حسین کے مزار کے پاس ایک مسجد بنوائی اور امام حسین کی قبر پر ایک گنبد تعمیر کروا کر اس پر ایک سبز پرچم نصب کیا اور مسجد

میں داخل ہونے کے لئے دو دروازے بنوائے۔ حضرت مختار نے اس ویران علاقے کو آباد کرنے کی غرض سے کئی خانوادوں کو مختلف علاقوں سے یہاں لا کر بسایا بھی۔ اس طرح ایک ویران مقام کے ایک بڑی زیارت گاہ میں تبدیل ہونے کا کام شروع ہوا۔

بنی امیہ کو اقتدار سے بے دخل کرنے والے پہلے عباسی حاکم السفاح نے 749 میں اس مقام پر دوسرا گنبد بنوایا اور مزار تک پہنچنے کے لئے دو نئے دروازے بنوائے لیکن 763 میں اسی قبیلے کے ایک حکمراں المنصور کے عہد میں امام حسین کے روضے پر بنی چھت گرا دی گئی اور گنبدوں کو منہدم کر دیا گیا۔ نو سال کے بعد جب عباسی خلیفہ المہدی مسند نشین ہوا تو اس نے امام حسین کے مزار پر پھر سے چھت تعمیر کروائی۔

787 میں عباسی خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں قبر پر لگا بیری کا وہ درخت کاٹ دیا گیا جس کی وجہ سے امام حسین کی قبر کو دور سے ہی پہچان لیا جاتا تھا ہارون کو امام حسین کے روضے کی زیارت کے لئے آنے والوں کے بڑھتے ہجوم سے بھی خطرہ لاحق تھا غالباً اس کا خیال تھا کہ کہیں تمام مسلمان بادشاہت کے خلاف نہ ہو جائیں اس لئے اس نے روضے پر زائرین کے آنے جانے پر سخت پابندیاں عائد کیں۔

808 میں خلیفہ الامین کے دور میں ایک بار پھر سے امام حسین کا روضہ تعمیر کیا گیا۔

850 میں متوکل نام کا دشمن حسین تخت نشین ہوا تو اس نے نہ صرف یہ کہ روضے کو منہدم کر دیا بلکہ قبروں کے نشان مٹانے کے لئے ہل چلانے کا حکم بھی دیا لیکن وہ اس میں ناکام رہا کیوں کہ ہر بار ہل جوتنے والے بیل قبر تک جاتے تھے اور رک جاتے تھے۔ اللہ نے جانوروں کو اتنی عقل دی ہے کہ وہ خاندان نبوت کا احترام کریں۔

گیارہ سال بعد خلیفہ منتصر نے روضے کی دوبارہ تعمیر کروائی اور قبر کے آس پاس نئے گھر بنوا کر لوگوں کو آباد کیا لیکن پانچ سال بعد روضے کو پھر سے برباد کر دیا گیا۔ شہادت کے بعد بھی امام

حسین اور خاندان رسول سے دشمنی رکھنے والے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔
893 میں ایک بار پھر روضے کی تعمیر نو ہوئی اور اس بار دو گیٹ بنوائے گئے اور دو مینار بھی تعمیر ہوئے۔

کربلا میں امام حسین کے روضے پر معز الدولہ کے زمانے میں بہت رونق آئی۔ معز الدولہ کا تعلق ایران کے ایک فوجی خانوادے آل بویہ سے تھا جس نے عراق پر فتح پائی تو امام حسین کی عزاداری کا سلسلہ عوامی پیمانے پر شروع کیا۔ یہ خانوادہ امام حسین سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسی خانوادے کے ایک فرماں رواں عضد الدولہ فنہ خسرو نے امام کی قبر پر ساکھو کی لکڑی سے ایک شاندار ضریح تعمیر کروائی۔ روضے کے چاروں طرف گیلریاں بنوائیں، کربلا شہر کی تعمیر نو کر کے اس کی حد بندی کروائی اور لوگوں کو یہاں بسنے کی ترغیب دی۔ بعد میں عمران بن شاہین نام کے ایک شخص نے بویہ قبیلے سے طاقت چھین لی اور کافی دن تک عراق کے کئی شہروں پر حکومت کی اسی نے اپنے دور میں امام حسین کے روضے کے قریب ایک مسجد بنوائی۔

1016 میں روضے میں کسی وجہ سے آگ لگ گئی اور عمارت کو بہت نقصان پہنچا اس کے بعد وزیر حسن بن فضل نے عمارت کی پھر سے مرمت کروائی۔ 1223 میں ناصر الدین نے اس کو مزید پرشکوہ بنایا۔ 1365 میں سلطان اویس ابن حسن جلائیری نے ایک بار پھر سے روضے کے چاروں طرف نئی دیواریں تعمیر کروائیں اور دالانوں کو اونچا کیا۔ 1384 میں اس کے بیٹے سلطان احمد ابن اویس نے روضے کے دونوں میناروں کو پھر سے تعمیر کروایا اور احاطہ کو مزید وسعت دی۔ 1514 میں ایران کے شاہ اسمعٰیل صفوی نے امام کی قبر مطہر پر پر شیشے کے بہترین کام والی ایک ضریح بنوا کر رکھی۔ عباس شاہ صفوی نے 1622 میں اس ضریح پر تانبہ اور پیتل کا کام کروا کر اس کو مزید خوبصورت بنوایا اور روضے کے گنبد پر کاشی ٹائلس لگوائے۔
1638 میں سلطان مراد چہارم نے روضے کے گنبدوں کے حسن میں مزید اضافہ کیا۔ اس کے

بعد 1742 میں ایران کے مشہور و معروف افشار قبیلے کے بادشاہ نادر شاہ درانی نے بیش قیمت ہیرے جواہرات روضے چڑھائے اور اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگائے۔ 1796 میں آغا محمد شاہ قاچار نے گنبد پر خالص سونے کا پلاسٹر کروایا اور میناروں پر بھی سونے کا پتر چڑھوایا۔

1801 میں وہابیوں نے کربلا اور نجف پر حملہ کیا اور یہاں کے تمام بیش قیمت زیورات اور ہیرے جواہرات لوٹ لئے۔ 1817 میں ایران کے بادشاہ فتح علی شاہ قاچار نے امام حسین کے روضے کی دوبارہ مرمت کروائی اور وہابیوں نے جو نقصان پہنچایا تھا اس کی بھر پائی کی۔ 1866 میں نصیر الدین شاہ قاچار نے روضے کے احاطے کو مزید وسیع کیا۔

1939 میں بوہرو فرقہ کے روحانی پیشوا سیدنا طاہر سیف الدین نے روضے کے اندر ایک شاندار ضریح رکھوائی۔ یہ ضریح سونے، چاندی کے سکوں اور بیش قیمت جواہرات سے تعمیر کی گئی تھی۔ ضریح بنانے میں ایک ایک تولہ سونے کے پانچ سو سکے اور چاندی کے دو لاکھ سکے استعمال کئے گئے تھے۔ دو سال بعد سیدنا طاہر سیف الدین کی جانب سے مشرقی میناروں کی تزئین کاری کے لئے بے انتہا دولت خرچ کی گئی اور میناروں کو اوپر سے نیچے تک خالص سونے کا بناہا گیا۔ 1948 میں کربلا کے ایڈمنسٹریٹر سید عبدالرسول خالصی نے روضے کے چاروں طرف ایک سڑک تعمیر کروائی اور دالانوں کو مزید چوڑا کیا۔ 1991 میں جب یہاں کے لوگوں نے صدام حسین کے خلاف بغاوت کی تو عراقی افواج نے اس روضے پر حملہ کیا جس سے روضے کا کافی نقصان پہنچا لیکن صدام حسین کے سخت سنسر کی وجہ سے یہاں کی خبریں باہر نہیں آسکیں بعد میں عراقی حکومت نے ہی اس کی تعمیر کروائی اور تعمیر کا یہ کام 1994 میں مکمل ہوا۔ صدام حسین کے معزول ہونے کے بعد عراق میں تکفیری فرقہ کے لوگوں، عراقی القاعدہ اور بعث پارٹی کے ہمدردوں نے دہشت گردی کا جو طوفان بے تمیز اٹھایا اس کا سب سے بڑا نشانہ

یہی روضہ اوراس روضے کی زیارت کرنے والے ہیں۔پہلی بار عراقی دہشت گردوں نے دو
مارچ 2004 کوایک ساتھ چھ دھماکے کرکے امام حسین کے روضے کے آس پاس خون کا دریا
بہایا تھا۔اس کے بعد سے آج تک لگاتار یہ سلسلہ جاری ہے۔سخت سیکورٹی کی وجہ سے دہشت
گرد روضے تک نہیں پہنچ پاتے ہیں تو کربلا کی طرف جانے والے زائرین کونشانہ بناتے
ہیں۔اب تک ان حملوں میں کئی سوزائرین شہید ہوچکے ہیں لیکن یہ سلسلہ رکا نہیں ہے۔میری
موجودگی میں بھی پندرہ شعبان کو خیمہ گاہ سے کچھ دور پر ایک بم پھینکا گیا تھا جس میں تقریباً نو
لوگ شہید ہوئے تھے شہید ہونے والوں میں زیادہ تر خواتین تھیں۔

ان دھماکوں کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ ان کی ذمہ داری عراق کے سنیوں پر تھوپی جائے
اوراس بہانے سے شیعہ وسنی فرقہ کے درمیان فساد کروایا جائے۔دلچسپ بات تو یہ ہے کہ صدام
حسین کے خلاف جب امریکا نے فوجی کارروائی کی تو بعث پارٹی کے ہمدرد، تکفیری اور القاعدہ
کے لوگ بلوں میں چھپ گئے تھے اور امریکہ سے شیعہ فرقہ کے لوگ ٹکرا رہے تھے۔سب سے
زیادہ دیر تک مدافعت ان ہی علاقوں میں ہوئی جہاں شیعہ آباد تھے۔خاص کر نوجوان شیعہ
قائد مقتدیٰ صدر نے امریکا کی فوجوں کو سخت چنوتی دی اور ہتھیاروں کی کمی کے باوجود نہایت
جواں مردی سے امریکی جارحیت کا مقابلہ کیا۔اب عراق کو شیعہ وسنی فساد کی آگ میں جھونک
دینے کی سازش کرنے والے سی آئی اے کے اشارے پر یہاں خون کا دریا بہا رہے ہیں لیکن
ابھی تک شیعہ اور سنی فرقہ کے لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنے قدیم روابط برقرار رکھے
ہوئے ہیں اور کبھی بھی کسی شیعہ ہجوم نے سنی بستی پر یا سنی گروہ نے شیعوں پر حملہ نہیں کیا ۔

چار شعبان کی تقریب

آج پہلی بار اس سورج کی کرنوں نے میرے بدن کو چھوا جو کربلا میں ہر صبح امام حسین کے
روضے کو بوسہ دے کر آگے بڑھتی ہیں یعنی کربلا میں آج میری پہلی صبح تھی۔ہم لوگ تیار ہوکر
امام حسین کے روضے کی طرف چل دئے جہاں ایک خصوصی تقریب میں ہم سب مہمانوں کو مدعو
کیا گیا تھا۔جب ہم پہنچے تو تقریب شروع ہوچکی تھی۔اس میں امام حسین کے روضے پر کام
کرنے والے خادم شامل تھے۔تمام خدام ایک ہی یونی فارم پہنے تھے۔کتھئی رنگ کے کوٹ
اور پینٹ کے علاوہ ہلکے گلابی رنگ کی شرٹ ان کی یونیفارم ہے۔یہاں کسی کا کوئی بھی عہدہ ہو
ڈریس ایک ہی جیسا پہننا ہوتا ہے چھوٹے بڑے کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ان تمام خدام نے
پھول اور پرچم اٹھائے ہوئے تھے۔یہ لوگ امام حسین کی شان میں نغمے اور ترانے پیش کر
رہے تھے۔زبان میں سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن ہر لفظ دل میں اتر رہا تھا کیوں کہ مدحت امام
حسین کو سمجھنے کے لئے زبانوں سے نہیں آنکھوں سے کام لینا پڑتا ہے

کسی زباں میں ہوں نوحے سمجھ میں آتے ہیں
جو آنسوؤں نے لکھا وہ ادب حسین کا ہے

اس تقریب کے بعد ہم لوگ پھر خاتم الانبیا ہال میں چلے گئے جہاں جشن ربیع الشہادہ جاری
تھا۔آج کی تقریب میں روضے کی منتظمہ کمیٹی کے جنرل سکریٹری سعد الدین ہاشم نے روضوں
کے انتظام وانصرام کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ان کے بعد مختلف علما کی تقاریر ہوئیں۔
ظہر کی نماز کے وقت پروگرام ختم ہوا۔

جشن شہنشاہ وفا

امام حسین کے بھائی حضرت عباس نے قربانی، جانثاری، شجاعت، صبر اور ایثار کی ایسی نظیر کربلا کی جنگ میں پیش کی کہ وہ امام حسین کے بعد دوسرے سب سے اہم کردار بن گئے۔ ان کو فاتح فرات، سقائے سکینہ، ساقیٔ عطاش کربلا، شہنشاہ وفا، شیر علی، علمدار کربلا، شہید نہر علقمہ اور غازی عباس جیسے مختلف القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا یوم ولادت کربلا میں چار شعبان کو منایا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے چار شعبان کو حضرت عباس کے روضے پر نماز مغرب کے بعد ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد بھیڑ کی وجہ سے ہم لوگ آغا سلطان سے جدا ہو گئے تھے چوں کہ ابھی تک ہمارے خصوصی بیج نہیں بنے تھے اس لئے ہم کو اس گیٹ سے جانے کی اجازت نہیں مل پا رہی تھی جدھر سے مہمانوں کو اندر جانا تھا۔ جو لوگ گیٹ پر کھڑے تھے خدام کو عربی کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں آتی تھی اس لئے وہ ہماری بات نہیں سمجھ پا رہے تھے۔ بہر حال کچھ دیر بعد ان کی سمجھ میں آ گیا کہ ہم لوگ مہمان ہیں اور ہم کو وی آئی پی گیٹ سے داخلہ مل گیا۔ یہ تقریب بہت پر وقار تھی اس میں عربی کے کئی شاعروں نے اپنا کلام پیش کیا اور کئی علما نے حضرت عباس کی سیرت طیبہ پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد شاندار میناروں کی رونمائی صلواۃ کے نعروں کے ساتھ ہوئی۔ یہ دنوں مینار خالص سونے کی پلیٹوں کو جوڑ کر بنائے گئے ہیں۔ یہ دونوں مینار کئی دن سے غلاف میں تھے۔ اس تقریب کے دوران ان غلافوں اٹھا دیا گیا اور دو نئے مینار اس طرح نظر آنے لگے کہ جیسے کوئی وفادار اپنے ہاتھوں کو بارگاہ خداوندی میں بلند کر کے یہ دعا کر رہا ہو کہ اے اللہ تعالی اس اسلام کو سرخرو کر جو مظلومین کے ساتھ وابستہ ہے۔ میناروں کی رونمائی کے اس پروگرام میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی شریک ہوئے۔ ان میناروں کی تعمیر میں 108 کلو خالص سونا استعمال ہوا ہے اور تقریباً تین

سال کے عرصہ میں یہ بن کر تیار ہوئے ہیں۔

اسی تقریب میں عراقی فوج کے مشہور و معروف میجر جنرل عدنان سے ملاقات ہوئی وہ بہت محبت سے پیش آئے۔ میجر عدنان کو کربلا کے لوگ ایک ہیرو کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے مقتدیٰ صدر کے حامیوں کے ساتھ ہونے والے متوقع ٹکراؤ کو ختم کرنے میں بہت اہم رول نبھایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مقتدیٰ صدر کی مہدی ملیشیا کے سینکڑوں مسلح جانباز امام حسین کے روضے پر حاضری دینے کے لئے ہتھیاروں کے ساتھ پہنچے لیکن امام حسین کے روضے میں ہتھیار لے کر داخل ہونے کی ممانعت ہے۔ اس لئے کربلا کے محافظوں نے مقتدیٰ صدر کے فوجیوں کو اندر جانے سے روک دیا اس پر معاملہ بگڑ گیا اور ہوائی فائرنگ کی نوبت آ گئی جس کی وجہ سے بھگدڑ مچ گئی۔ اصل میں مقتدیٰ صدر کے ساتھی اپنے ہتھیار جمع کروانے پر اس لئے راضی نہیں تھے کہ امریکا کی جانب سے مسلسل یہی کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنے ہتھیار رکھ دیں۔ مقتدیٰ صدر کی مہدی ملیشیا کے مسلح سپاہیوں کو خوف تھا کہ اگر وہ ہتھیار رکھ کر اندر زیارت کے لئے گئے تو قریب ہی میں موجود امریکی فوجی دھاوا بول کر ان کو گرفتار کر سکتے ہیں۔ دنوں طرف کے لوگ اپنی اپنی بات پر اڑے تھے اسی بیچ میجر جنرل عدنان نے مداخلت کی اور بہت تدبر کے ساتھ معاملات کو سنبھال لیا۔ مہدی ملیشیا کے لوگ زیارت کئے بغیر ہی چلے گئے اور خون خرابہ ٹل گیا اسی وجہ سے میجر جنرل عدنان کو بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ میجر عدنان نے ہم لوگوں کو بہت محبت کے ساتھ ڈنر پر مدعو کیا اور اپنی فوجی گاڑیوں میں ہم سب کو لے کر کربلا کے ایک مشہور ریسٹورنٹ الدرالنصراوی پہنچے جہاں ہم نے عراق کے روایتی کھانوں کا مزہ لیا۔ رات بارہ بجے میجر عدنان کی فوجی گاڑیاں ہم کو ہمارے ہوٹل پر اتار کر واپس چلی گئیں۔

حضرت عباس کے روضے کی تاریخ

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ امام حسین کے روضے سے تھوڑے فاصلے پر کربلا کا دوسرا اہم ترین روضہ واقع ہے۔ یہ روضہ امام حسین کے چھوٹے بھائی حضرت عباس کا روضہ ہے۔ دونوں روزوں کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا مکہ میں صفا و مروا کی پہاڑیوں کے درمیان ہے۔ ان دونوں روضوں کے درمیان ایک راہ داری ہے جس کے دنوں کناروں پر کھجور کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ امام حسین اور حضرت عباس کے روضوں کے چاروں طرف ایک گول سڑک ہے اور اوپر سے دیکھنے میں ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایک انگوٹھی میں دو نگینے جڑے ہوں

حضرت عباس کے روضے کی تاریخ تلاش کرنے میں مجھ کو کافی دقت ہوئی کیوں کہ الگ سے کہیں اس کا ذکر نہیں مل رہا تھا ظاہر ہے کہ حضرت عباس کی زندگی کا ہر لمحہ امام حسین کے ساتھ وابستہ رہا تو بھلا روضے کا تعلق بھی امام حسین سے کیوں وابستہ نہ رہتا؟ پھر بھی میں نے کچھ نئی باتیں معلوم کرنے کی غرض سے کربلا کے روضوں کا مینجمنٹ دیکھنے والی کمیٹی کے میڈیا سیل میں اپنے ایک دوست حیدر منکوشی سے مدد مانگی تو انھوں نے فوراً ای میل کے ذریعہ عربی زبان میں مجھ کو حضرت عباس کے روضے کی تاریخ سے متعلق کچھ مواد بھیج دیا جس کا میں نے اردو میں ترجمہ کروایا تو کچھ دلچسپ اور نئے واقعات سامنے آئے گو کہ ان میں سے کچھ کا ذکر امام حسین کے روضے کی تاریخ کے باب میں بیان کر چکا ہوں لیکن ان کو دوہرانے میں بھی میں سمجھتا ہوں کوئی ہرج نہیں ہے۔ میڈیا سینٹر کے فراہم کردہ تاریخ میں اس روضے کی تاریخ یوں بیان کی گئی ہے۔

13 محرم 61 ہجری کو یعنی کربلا کے المناک واقعہ کے تین دن بعد حضرت امام حسین، ان کے عزیزوں اور اصحاب کی لاشوں کو امام سجاد علی ابن الحسین کی جناب سے طئے شدہ مقامات پر سپرد خاک کیا گیا۔ امام سجاد کی ہدایت پر قبروں پر ایسی علامتیں بنائی گئیں جو ہمیشہ باقی رہنے والی

تھیں۔ یہ زمین بنو اسد کی تھی جو اس علاقہ میں آباد تھے (اس زمین کو امام حسین نے بنی اسد سے اپنی زندگی میں خرید لیا تھا) مورخین کا بیان ہے کہ تدفین کے بعد امام حسین کی قبر پر کھجور کے پتوں کا ایک شامیانہ بھی بنایا گیا اور اسی سے مشابہ ایک شامیانہ حضرت عباس کے روضے پر بنایا گیا۔

65 ہجری میں اموی خلیفہ مروان ابن عبد الملک کے دور میں کوفے سے توابین کا ایک گروہ کربلا کے لئے روانہ ہوا۔ اس میں 4 ہزار لوگ شامل تھے اور اس کی قیادت ایک جلیل قدر صحابی سلیمان بن صرد خزاعی کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے قتل امام حسین کا انتقام لینے کا عہد کیا اور امام حسین کی قبر کے ارد گرد اس طرح سے جمع ہو گئے جیسے کہ کعبے میں حجر اسود کا بوسہ لینے کے لئے حجاج جمع ہوتے ہیں۔

66 ہجری میں کوفے سے یزیدی فوجوں کو بے دخل کرنے والے حسینی جانثار حضرت مختار نے حضرت مالک اشتر کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کو اس ہدایت کے ساتھ کربلا بھیجا کہ وہ قبر امام حسین پر ایک پرشکوہ عمارت بنوائیں اور اس کے نزدیک ایک مسجد تعمیر کریں۔ حضرت مختار نے کربلا کو آباد رکھنے کے لئے ایک گاؤں بسائے جانے کی ہدایت بھی دی۔

198 ہجری میں عباسی خلیفہ مامون نے اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے علویوں اور اہل بیت رسول کا دل جیتنے کی پالیسی کے تحت امام حسین کے جانشین حضرت امام رضا کو نہ صرف اپنا جانشین بنایا بلکہ اہل بیت کے چاہنے والوں کو خوش کرنے کے لئے امام حسین کے روضے کی تعمیر و توسیع کا اہتمام بھی کیا۔ چنانچہ بلند چبوترے اور وسیع کیمپس کی تعمیر ہوئی جہاں ایک بار پھر سے لوگ آباد ہوئے۔ مامون کے دور حکومت میں دوبارہ روضوں کی تزئین کاری ہوئی۔

247 ہجری میں عباسی گورنر المنتصر نے سیاسی فائدے اٹھانے اور عوام کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے امام حسین کے روضے کی زیارت کے لئے جانے والوں کو کچھ سہولیات

فراہم کیں اور آمدورفت میں آسانی کے لئے روضوں کے اردگرد ایک سڑک تعمیر کروائی۔

283 میں طبرستان کے حاکم محمد بن زید (جن کا لقب اسراعی الصغیر ہے) نے روضوں کی تزئین اور توسیع کروائی۔

369 میں جب عضد الدولہ ابن رکن الدولہ نے امام حسین اور ان کے بھائی حضرت ابو الفضل العباس کے روضے کا قصد کیا تو اس نے عمارت کی تجدید کاری کا حکم دیا اور روضوں کو ہاتھی دانت کی نقاشی اطلس وکمخواب کے پردوں اور زیورات سے آراستہ کیا۔ روضوں کے ارد گرد روشنی کا انتظام کیا، کربلا کو ایک شہر کی شکل دی، پانی کا وافر انتظام کیا، روضوں کی بلند و بالا دیواروں سے حد بندی کی گئی جن کا احاطہ 2400 میٹر کا تھا۔ پورے علاقہ کو سرسبز و شاداب کرنے کے بھی بھرپور انتظامات کئے، اس علاقہ کی تمام آراضی کو امام حسین کے حرم کے نام وقف کیا، روزمرہ کا سامان بیچنے والوں کے لئے یہاں خاص بازار بھی بنائے گئے تاکہ زائرین کو سب چیزیں آسانی سے دستیاب ہوں۔ عضدالدولہ نے سادات اور علما کے ساتھ بھی بہت فرخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

دوسال بعد عضدالدولہ نے اپنے سالانہ پروگرام کے تحت ایک بار پھر کربلا کی زیارت کا سفر کیا اور یہاں پہنچنے کے بعد انھوں نے امام حسین کے روضے کی تعمیر کے ساتھ ساتھ حضرت عباس کے روضے کی طرف بھی اپنی توجہ مرکوز کی۔ سید سلیمان نے ذکر کیا ہے کہ 372 ہجری میں مطابق 983 عیسوی میں پہلی بار حضرت عباس کی قبر پختہ کی گئی اور عضد الدولہ کے عہد میں قبر پر ایک چبوترہ اینٹوں اور گارے سے بنایا گیا۔

380 ہجری میں جنوبی عراق کے افراد میں سے عمران بن شاہین نے روضے کی تعمیر میں حصہ لیا۔ انھوں نے روضۂ امام حسین کے قریب میں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی جو ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مسجد روضے کے شمالی حصہ میں تھی لیکن اب اس کو روضے کی کیمپس میں ہی شامل

کرلیا گیا ہے۔

400 ہجری میں سلطان الدولہ کے وزیر نے تعمیر وتجدید کا کام کیا۔ 410 میں وزیر حسن ابن مفضل بن سہلان نے تعمیر میں حصہ لیا۔ 450 میں حکومت بنی مزید الاسدیہ کے حاکم دبیس الاسدی نے روضوں کی رونق میں اضافے کے لئے تعمیری کام کئے۔ 545 میں عباسی خلیفہ الناصر الدین اللہ نے بھی روضوں کی تمیر میں حصہ لیا اور اس کے بیٹے احمد بن ناصر الدین اللہ نے 620 میں روضوں کی تعمیر میں حصہ لیا۔ 620 ہجری میں ایلخان محمود غازان نے روضے کی دیکھ بھال کرنے والوں کو عطیات سے نوازا اور نہر فرات سے پانی کی فراہمی جاری رکھنے کے لئے بہتر انتظامات کئے۔

اس کے بعد بھی بہت سے امرا اور شاہوں نے اپنی اپنی توفیق کے مطابق روضوں کی تعمیر وتوسیع میں حصہ لیا جس کا تاریخی حوالوں میں ذکر موجود ہے لیکن صرف حضرت عباس کے روضے کا ذکر الگ سے نہیں ملتا۔ حضرت عباس کے روضے کی تعمیر کا تفصیلی ذکر ایران کے شاہ عباس صفوی کے دور میں ملتا ہے جو شاہ تہماسپ کا پوتہ تھا۔ ان حوالوں کے مطابق 1622 میں شاہ عباس نے حضرت عباس کے روضے کی تعمیر میں کافی دلچسپی لی اور اس کو سجانے کے لئے بیش قیمت ہیرے جواہرات بھیجے اور ایران کے بہترین قالین بھی یہاں بچھوائے۔ شاہ عباس صفوی نے گنبد و مینار پر خوبصورت ٹائلس لگوا کر ان کو مزید خوبصورتی عطا کی۔

1804 میں وہابیوں کے حملے میں امام حسین اور حضرت عباس کے روضوں کو بہت نقصان پہنچا روضوں کی مرمت کے لئے اودھ کے نواب کی جانب سے ایک خطیر رقم بھیجے جانے کا ذکر کربلا کے روضوں کی تاریخ میں ملتا ہے لیکن نام نہیں لکھا ہے کہ کس نے یہ رقم بھیجی لیکن جو زمانہ لکھا ہے اس کے حساب سے وہ زمانہ نواب آصف الدولہ بہادر کا تھا۔ اس وقت کے عراقی مرجع تقلید آیت اللہ العظمیٰ سید طباطبائی کی دیکھ ریکھ میں اس پیسے سے حضرت عباس کے روضے کی تعمیر نو

ہوئی۔1806 میں محمد حسین اصفہانی نے میناروں کو بہت خوبصورت Imported ٹائلس سے سجوایا۔۔1821 میں سلطان فتح علی شاہ قاچار کے پوتے محمد شاہ نے حضرت عباس کی قبر مبارک کے لئےٹھوس چاندی کی ایک ضریح تعمیر کروائی۔کربلا سے ملے تاریخی حوالوں میں اس بات کا ذکر بھی ہے کہ اودھ کے حکمراں نصیر الدین حیدر کی اہلیہ محترمہ تاج محل صاحبہ نے بھی روضے کی تعمیر کے لئے ایک بڑی رقم بھیجی تھی۔1839 میں لکھنو کے حاکم محمد علی شاہ نے نے برطانوی ریزیڈنٹ کی معرفت تین لاکھ چاندی کے سکے بھیجے۔اس رقم سے حضرت عباس کے روضے کی تزئین کاری ہوئی۔کئی ایرانی اور ترکی شاہوں نے بھی روضوں کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ترکی کی سلطنت عثمانیہ نے بھی کافی اچھی طرح روضوں کی دیکھ بھال کی ۔1892 میں حضرت عباس کے روضے پر سونا چڑھانے کے سلسلہ بھی شروع ہوا۔1894 میں حاجی امین السلطان نام کے ایک رئیس نے حضرت عباس کے روضے میں داخلے کے لئے بنے گیٹ پر ایک شاندار گھڑی نصب کروائی۔بیسویں صدی میں عراق کے عوام نے اصرار کیا کہ حضرت عباس کے روضے پر بھی ان کے بھائی مام حسین کی طرح سنہری گنبد بنایا جائے۔اس کے بعد حضرت عباس کے روضے پر سونے کی اینٹیں لگانے کا کام شروع ہوا اور 6418 سونے کی اینٹوں سے 1955 میں سنہری گنبد بن کر تیار ہوا۔2005 میں حضرت عباس کے روضے پر یک بار پھر سے تعمیر کا کام شروع ہوا اور اب یہ کام آیت اللہ العظمیٰ سید علی سیستانی کے دفتر کی زیر نگرانی اوقاف کی منتظمہ کمیٹی کی طرف سے ہو رہا ہے۔جس کے باعث روضہ مسلسل خوبصورت ہوتا جا رہا ہے۔اسی تعمیری سلسلے کے تحت روضے کے دونوں میناروں کی تعمیر میں 108 کلو خالص سونے کی اینٹوں کا ستعمال کیا گیا ہے۔ میناروں کے افتتاح کے موقع پر پتہ چلا کہ یہ روضہ دو تین سال کے اندر پوری طرح بن جائے گا اور ہو بہو ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ امام حسین کا روضہ اب ہو گیا ہے۔

حضرت عون و حضرت حر کا روضہ

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تمام شہدائے کربلا کی اجتماعی قبر امام حسین کی قبر کے پاس ہی واقع ہے اور امام حسین کے دنوں فرزندوں حضرت علی اکبر اور حضرت علی اصغر کی قبریں امام کے پہلو میں بنی ہیں۔صرف امام حسین کے دوست حبیب ابن مظاہر کی قبر الگ سے بنائی گئی ہے وہ شائد اس لئے الگ بن سکی کہ روایتوں کے مطابق حضرت حبیب کی اہلیہ میدان کربلا سے کچھ دور پر ہی قیام پذیر تھیں اور اپنے غلام کے ذریعہ تازہ حالات سے آگاہ ہو رہی تھیں۔ روایتوں میں ہے کہ انھوں نے اپنے شہور کی شہادت کی خبر سننے کے بعد غلام کی معرفت حضرت حبیب ابن مظاہر کی لاش کے لئے کفن بھی بھیجا تھا غالباً حضرت حبیب ابن مظاہر کی اہلیہ نے اپنے شوہر کی قبر الگ سے بنوائی اسی لئے وہ شہدا کی اجتماعی قبر کا حصہ نہیں ہے۔

لیکن مجھے اس وقت بہت حیرت ہوئی کہ جب مجھے یہ بتایا گیا کہ کربلا سے کوئی پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر بغداد جانے والے راستے پر حضرت زینب کے صاحبزادے حضرت عون بن عبداللہ بن جعفر کا روضہ ہے۔میں نے مجلسوں میں یہی سنا تھا کہ حضرت زینب کے دنوں بیٹوں یعنی حضرت عون و محمد نے ایک ساتھ مل کر ہی یزیدی فوجوں پر حملہ کیا اور ایک ساتھ ہی جام شہادت نوش کیا۔ مجلسوں میں یہ بھی پڑھا جاتا ہے کہ امام حسین نے دنوں بچوں کی لاشیں گنج شہیداں میں لاکر رکھیں۔مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ حضرت عون جوش وغا میں یزید کے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کا پیچھا کرتے ہوئے اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ اس مقام تک پہنچ گئے اور یہیں شہادت پائی۔یہ روضہ بالکل سڑک کے پاس ہے اور یہاں بھی کئی دوکانیں موجود ہیں جہاں سے لوگ سوغات خریدتے ہیں۔بہرحال یہاں آکر میری معلومات میں اضافہ ہوا کہ عباس علمدار کے ایک بھانجے نے یزیدی افواج کو اس قدر دور تک دوڑایا تھا۔یہاں سے ہم لوگ

حضرت حر کے روضے کی طرف روانہ ہوئے جو کربلا سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حضرت حر کو دوسرے شہدائے کربلا سے الگ دفن کرنے کی وجہ میری سمجھ میں تو یہی آئی کہ ان کی زوجہ یا قبیلے والوں نے حضرت حر کی لاش کو وہاں سے اس وقت ہٹالیا تھا جب فوج یزید کی جانب سے رسول کے جگر کے ٹکڑوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا جا رہا تھا اور گنج شہیداں سے تین چار میل دور لے جا کر دفن کر دیا تھا۔

حضرت حر روضہ کی دیواریں دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ کافی پرانے زمانے کا ہے۔ دیواروں پر گولیوں کے بے شمار نشان تھے جو غالباً امریکی فوجوں اور عراق کے حریت پسندوں کے درمیان معرکہ آرائی کا نتیجہ تھے لیکن اب اس کی تعمیر نو ہو رہی ہے اور بہت ہی شاندار عمارت بن رہی ہے۔ لوگ اندر ضریح کے پاس نہیں جا سکتے کیوں کہ تعمیری کام بہت تیزی سے جاری ہے۔ جب تک یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہوگی اس وقت تک حضرت حر کا روضہ تعمیر ہو چکا ہوگا۔ اس روضے کی دیواروں سے ملحق ہی صحنچیاں بنی ہوئی ہیں جس میں نماز پڑھنے کا انتظام ہے۔

میں نے یہاں پہنچ کر کربلا کے اس مجاہد کو سلام کیا جس نے عیش و عشرت بھری زندگی پر لات مار کر جام شہادت نوش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس جری کی قربانی کے عیوض اس کو ایسا انعام دیا کہ پیشانی پر جناب فاطمہ زہرا کے ہاتھ کا بنا ہوا رومال امام حسین نے اپنے ہاتھوں سے باندھا۔ حشر تک یہ رومال اس شہید کی عظمت کی گواہی دے گا اور اس شہید کا روضہ رہتی دنیا تک ہر انسان کو یہ پیغام دیتا رہے گا کہ اصل زندگی وہ ہے جو ظالموں کے سائے میں نہیں مظلومیت کے تپتے ہوئے صحراؤں میں کاٹی جائے۔ مجھے یہاں یہ سوچ کر بہت اچھا لگ رہا تھا کہ یہ اس مجاہد کا روضہ ہے جس نے حق والوں کی بستی میں صرف چند گھنٹے قیام کیا لیکن چند گھنٹوں کی یہ زندگی عاشور سے لے کر روز قیامت تک دنیا پر محیط ہوگئی۔

واپس ہم لوگ کربلا آئے تو مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ آغا سلطان نے کہا کہ ہم لوگ

مغربین کی نماز پڑھنے کے لئے مقام امام زمانہ جائیں گے۔ اصل میں یہ جگہ کربلا میں نہر فرات کے ایک کنارے پر واقع ہے۔ اس کو مسجد صاحب الزمان بھی کہا جاتا ہے۔ اس مسجد کے لئے کہا جاتا ہے کہ امام زمانہ یہاں نماز ادا کرتے رہے ہیں اور لوگوں سے ان کی ملاقات بھی ہوئی ہے۔ مسجد صاحب زمان ایک لمبی سی پٹی کی شکل میں بنی ہوئی ہے چوڑائی زیادہ نہیں ہے صرف تین چار صفیں نمازیوں کی بن سکتی ہیں لیکن لمبائی کافی ہے اس لئے ایک وقت میں ڈیڑھ دو سو آدمی آسانی سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔

ہم نے یہاں مغربین کی نماز ادا کی اور اپنے امام سے دعائیں مانگیں۔ میں نے یہاں بہت گڑگڑا کر دعا کی کہ اے مولا مجھے کوئی تحفہ عنایت کریں۔ مجھ پر کچھ عنایت کریں۔ خود اپنے دست مبارک سے آپ بھلے ہی مجھے کوئی تحفہ نہ دیں لیکن کسی مومن کے ہاتھ سے ہی مجھے ایک ایسا تحفہ دلوا دیجئے جس کو میں آپ کی سوغات سمجھ کر رکھوں۔ بہت دیر ہم مسجد امام زمانہ میں رہے لیکن میری دعا قبول نہیں ہوئی لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ میرا مولا مجھ پر مہربانی ضرور کرے گا۔

مسجد سے نکل کر ہم لوگ الحسین نام کے ایک اوپن ائیر ریسٹورنٹ میں آئے جہاں آغا سلطان کے ایک عراقی دوست نے ہم سب کی دعوت کی تھی۔ بہت ہی خوش مزہ کبابوں سے یہاں ہماری خاطر داری ہوئی ہے اور خاص ہندوستانی ذائقہ کا احساس دلوانے کے لئے ہری مرچیں بھی دسترخوان پر سجائی گئی تھیں۔

جشن ربیع الشہادہ کا اختتام

8 شعبان کو جشن ربیع الشہادہ کی آخری تقریب تھی۔اس تقریب کا انعقاد حضرت عباس کے روضے پر کیا گیا تھا۔اس کو تقریب سلام کا نام دیا گیا تھا۔ہم لوگ تاخیر سے پہنچے اور اس تقریب میں شرکت سے محروم رہے۔اس کے بعد دوسری تقریب روضے کے اندر ہی فرسٹ فلور پر قائم کئے گئے ایک ہال میں منعقد ہوئی جہاں ہزاروں نایاب قلمی کتابیں اور مخطوطات رکھے گئے ہیں۔جدید ترین سہولتوں سے آراستہ اس مرکز میں اسلام کے متعلق بہترین کتابیں موجود ہیں۔ان مخطوطات کی دیکھ بھال کے بھی بہت بڑے پیمانے پر انتظامات کئے گئے ہیں۔کتابوں اور مخطوطات کی فوٹو کاپیاں بنانے کے لئے جدید اسکینرس لگائے گئے ہیں اور ایسے انتظامات کئے گئے جن سے فوٹو کاپی بنانے میں کتاب کو نقصان نہ پہنچے۔ہم لوگوں کو گراؤنڈ فلور پر واقع میوزیم بھی دکھایا گیا جہاں وہ بیش قیمت سامان رکھا ہے جو دنیا کے امرا اور شہنشاہوں نے حضرت عباس کے قدموں میں چڑھایا تھا۔ہم لوگوں کو یہاں پر قائم کی گئی وہ لائبریری بھی دکھائی گئی جس میں اسلام اور دنیاوی علوم سے متعلق ہزاروں اہم ترین کتابیں مختلف زبانوں میں موجود ہیں۔

بعد میں ہم سب نے روضے پر ہی ظہرین کی نماز پڑھی اور دوپہر کا کھانا حضرت عباس کے روضے پر بنے مہمان خانے میں کھایا۔ہم اور عین الحسن واپس ہوٹل آگئے کیوں کہ مجھے خبر بنا کر اخبار کے لئے بھیجنا تھی۔سپہر کو وفد کے دوسرے لوگوں نے بتایا کہ ان کو حضرت عباس کے روضے کی منتظمہ کمیٹی نے اس بات کا موقع دیا تھا کہ وہ حضرت عباس کی ضریح میں جا کر وہ رقم تھیلوں میں جمع کریں جو وہاں مومنین کی جانب سے چڑھائی جاتی ہے۔اس اہم ترین سعادت سے محروم رہنے کا مجھ کو زندگی بھر ملال رہے گا۔

پسران حضرت مسلم کا روضہ

تیسرے پہر ہم لوگ آغا سلطان کے ایک دوست فلاح کے ہمراہ مسیب کے لئے روانہ ہوئے یہ جگہ کربلا سے تقریباً 40 کلومیٹر دور واقع ہے۔اس جگہ پر ایسے دو بچوں کی مظلومی کا قصہ تحریر ہے جس کو سن کر ایک پتھر دل انسان کی آنکھ سے آنسو نکل آئیں گے۔یہاں پر قبریں ہیں خاندان رسالت کے دو بچوں کی، جن کو پسران مسلم کہا جاتا ہے۔

تاریخوں میں درج ہے کہ جب امام حسین نے اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل کو کوفے کی جانب اپنا سفیر بنا کر روانہ کیا تو ان کے دو بچے بھی اپنے والد کے ساتھ اس خیال سے کوفے گئے کہ کوفہ نیا شہر ہے اس کو دیکھیں گے شائد بچوں کے دل میں یہ بھی خیال رہا ہوگا کہ اس شہر کو دیکھیں جس کو ان کے دادا حضرت عقیل کے بھائی حضرت علی ابن ابی طالب نے اپنی خلافت کے زمانے میں راجدھانی بنایا تھا۔ان بچوں کو کہاں علم تھا کہ وہ ایک ایسے شہر میں جارہے ہیں جہاں اب درندوں کی حکمرانی ہے۔

حضرت مسلم جب کوفے میں پہنچے تو دو تین دن کے قیام کے بعد ہی ان کو ابن زیاد کی فوجوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا، حضرت مسلم ہزاروں سے تنہا لڑتے رہے اور آخر کار شہید ہوئے۔حضرت مسلم کی شہادت کے بعد ان کے دونوں بچوں حضرت براہیم اور حضرت محمد بن مسلم کو ابن زیاد کی فوجوں نے گرفتار کرلیا اور خاندان رسالت کے آٹھ اور نو سال کے ان بچوں کو قید خانے میں ڈال دیا۔یہ بچے ایک سال تک قید خانے میں رہے۔اسی درمیان کربلا میں ان کے چچا امام حسین کو یزیدی افواج نے شہید کر دیا۔قید و بند میں گرفتار یہ مظلوم بچے رات دن اپنے والد کو یاد کرتے رہے ان کی مظلومی پر ایک دن قید کے ایک داروغہ کو ترس آ گیا اور اس نے بچوں کو چپکے سے راتوں رات رہا کر دیا اور کہا کہ جاؤ تم لوگ رات کی تاریکی میں

یہاں سے مدینے چلے جاؤ۔ رہائی کے بعد کوفے کے گلی کوچوں سے ناواقف یہ دونوں مظلوم بچے راہ بھٹک گئے اور ایک گھر کے کے باہر بیٹھ کر اشک افشانی کرنے لگے۔ اس گھر میں رہنے والی ایک خاتون باہر آئی اور ان بچوں سے ان کے خاندان کے بارے میں دریافت کیا اور سارا واقعہ معلوم کیا۔ یہ خاتون خاندان رسالت سے محبت کرتی تھی اس لئے جب اس کو معلوم ہوا کہ ان بچوں کو تعلق رسول کے گھر سے ہے تو وہ بچوں کو گھر کے اندر لے گئی لیکن اس مومنہ کی پریشانی یہ تھی کہ اس کا شوہر حارث سخت ترین دشمن اہل بیت تھا اور ابن زیاد کی فوج کا ایک افسر تھا۔ مومنہ نے ان یتیم بچوں کو ایک کمرے میں لے جا کر ہدایت دی کہ وہ خاموشی سے یہاں رات بسر کریں اور جب صبح اس کا شوہر چلا جائے گا تو وہ ان کو کوفے سے باہر کسی طرح پہنچانے کا انتظام کرے گی۔

یہ دونوں بچے اس کمرے میں سو گئے صبح کے وقت ایک بھائی نے خواب دیکھا اور اس کے بعد رونا شروع کر دیا۔ اس کے بعد دوسرے بھائی کی آنکھ بھی کھل گئی۔ بڑے بھائی نے چھوٹے سے بتایا کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ ان کے والد حضرت مسلم آئے ہیں اور کہہ رہے کہ بہت جلد تم دونوں مجھ سے آن ملو گے۔ چھوٹے بھائی نے کہا کہ اس نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے۔ دنوں بھائی سمجھ گئے کہ اب شہادت کا وقت آ گیا ہے۔ ایک دوسرے سے لپٹ کر گریہ کرنے لگے اس کی وجہ سے حارث ملعون کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کمرے میں جا کر دیکھا تو حضرت مسلم کے یتیم بچے اندر موجود تھے۔ اس ملعون نے ان یتیموں پر ترس کھانے کے بجائے دونوں کو قید کر لیا اور اور صبح کو فرات کے کنارے لے جا کر ان کو نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔ اسکے بعد ظالم نے دونوں بچوں کی لاشیں فرات میں ڈال دیں۔ ان مظلوموں کی لاشیں تیس پینتیس کلومیٹر دور مسیب نام کے گاؤں میں کنارے پر لگیں تو گاؤں والوں نے ان کو دفن کیا اور اب وہیں پر دونوں یتیموں کا روضہ بنا ہوا ہے۔ اس روضے میں جا کر مجھ پر ایسی

رقت طاری ہوئی کہ جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ یہاں میں نے اور پروفیسر عین الحسن نے نوحہ پڑھا اور خوب روئے۔ ہندوستان میں جو روایتیں پڑھی جاتی ہیں ان کے مطابق ان دنوں بچوں کو حضرت مسلم کی شہادت کے فوراً بعد ہی شہید کر دیا گیا تھا۔ بہر حال روایتوں میں اختلاف ہونے کے باوجود ان بچوں کی مظلومی میں ایک ذرا سی بھی کمی نہیں آتی۔

کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کی زیارت کرنے کے لئے جانے والے سب ہی قافلے ان یتیموں کے روضے پر بھی ضرور جاتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ علاقہ کافی آباد ہو گیا ہے روضے کی طرف جانے والے راستے پر بہت سی دکانیں کھل گئی ہیں لیکن اس گاؤں تک ترقی کا پروانہ ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ یہاں کے باشندے ابھی تک اپنی قدیم روایات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ مسیب آنے والے زائرین کے ساتھ بہت گرم جوشی سے پیش آتے ہیں۔

یہاں ہمارے ساتھ آغا سلطان کی والدہ، ان کی دو بہنیں اور بہنوئی عباس علی پوری بھی تھے یہ لوگ ہندوستانی وفد کا حصہ نہیں تھے بلکہ زائرین کے لئے جاری ہونے والا عام ویزہ لے کر زیارت کے لئے آئے تھے۔ اس طرح کل ملا کر ہم لوگوں کی تعداد آٹھ ہو گئی تھی۔

سیکورٹی کا انتظام یہاں بھی بہت سخت تھا۔ ہم لوگ چوں کہ ایک عام زائر کی حیثیت سے آئے تھے اس لئے ہم کو موبائل اور لیپ ٹاپ یہاں جمع کروانا پڑے۔

پسران حضرت مسلم کے روضے کی زیارت کے بعد ہم لوگ ہوٹل میں واپس آئے اور رات کو جشن ربیع الشہادہ کی اختتامی تقریب میں شامل ہوئے۔ خاتم الانبیا ہال میں ہی تقاریر ہوئیں اور تمام مہمان ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ اسی جشن میں برطانیہ سے آئے ہوئے ایک مہمان نے مجھ سے آگرہ میں مدفون روحانی رہنما اور عظیم عالم دین حضرت نور اللہ شوستری مرحوم یعنی شہید ثالث کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کو تعلق بھی حضرت شہید ثالث کے خانوادے سے ہے۔ (جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ حضرت نور اللہ

شوستری کو جو اکبر اعظم کے زمانے میں ہندوستان کے قاضی القضاۃ تھے، شرابی اور اوباش مغل بادشاہ جہانگیر نے احقاق الحق نام کی کتاب لکھنے کی پاداش میں قتل کروادیا تھا۔)

ان تقاریب کے ساتھ ہی جشن ربیع الشہادہ کا اختتام ہوگیا شام کو امام حسین کے روضے کی منتظمہ کمیٹی کی طرف سے تمام مہمانوں کی دعوت ہوئی۔ بعد میں ہم سب نے حضرت عباس اور امام حسین کے روضوں پر کافی وقت گزارا اب ہماری مہمان داری ختم ہوچکی لیکن ہم لوگوں کو ابھی کئی دن اور یہاں قیام کرنا تھا کیوں کہ پندرہ شعبان کو کربلا میں زبردست تقریب ہوتی ہے جس میں چالیس پچاس لاکھ افراد شرکت کرتے ہیں۔ کربلا میں پندرہ شعبان کا جشن یعنی امام زمانہ حضرت ولی عصر امام مہدی کا یوم ولادت ان کے جد کے روضے پر منانے کے لئے عراق کے دور دراز علاقوں سے لاکھوں لوگ پیدل چل کر کربلا پہنچتے ہیں۔ اس لئے اس جشن میں شرکت کی سعادت سے محروم ہونے کا تصور بھی ہمارے لئے ناممکن تھا۔

اس زمانے میں ہوٹلوں اور مہمان خانوں میں زبردست بھیڑ ہوجاتی ہے۔ ہوٹلوں کے دام اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ آپ روضوں کے آس پاس کے ہوٹلوں میں قیام کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ہوٹلوں کی بکنگ کئی کئی مہینے پہلے ہی سے ہوجاتی ہے۔ ہم جس ہوٹل میں قیام پذیر تھے اس کے مالکوں نے ہم لوگوں کو بتایا کہ پورا ہوٹل سعودی عرب سے آنے والے کاروان زہرا نام کے ٹور آپریٹر نے بک کررکھا ہے اس لئے ہم کو دوسرا ہوٹل تلاش کرنا ہوگا۔

آغا سلطان نئے ہوٹل کی تلاش میں لگ گئے ہم لوگوں کو اب ایک عام زائر کی طرح رہنا تھا۔ مجھے اب زیادہ اچھا لگ رہا تھا کیوں کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ عام زائرین کو کیا کیا دقتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔

سامرہ میں ایک دن

گزشتہ رات ہماری مہمان داری ختم ہوگئی اس لئے اب ہم کو نئے ہوٹل میں شفت ہونا تھا لیکن ہم لوگ ہوٹل میں شفت ہونے کے بجائے سامرہ اور بغداد کے سفر پر نکل رہے تھے۔ سامان باندھ کے کمروں میں ہی رکھ دیا تھا لیکن کمرے خالی نہیں کئے تھے۔ رات کو دیر تک ہم لوگ جاگے تھے پھر بھی بہت سویرے اٹھ گئے۔ سامرہ جانے کے لئے ہم لوگوں کو گاڑیاں ہمارے میزبانوں نے ہی فراہم کروائی تھیں۔ صبح سویرے ہم لوگ کربلا سے 260 کلومیٹر دور سامرہ کے لئے روانہ ہوائے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ سامرہ کو عباسی خلیفہ معتصم نے خانہ جنگی کی صورتحال کے باعث اپنا فوجی مستقر بنا کر اس کو راجدھانی کا درجہ دے دیا تھا۔ امام علی نقی اور امام حسن عسکری نے یہاں خانہ قید کا زمانہ گزارا تھا اور اسی شہر کی ابی احمد شاہراہ پر واقع ایک گھر نما قید خانے میں دونوں اماموں کی شہادت ہوئی تھی۔ اماموں کے گھر سے کچھ فاصلے پر معتصم نے ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ ان دنوں اماموں کو ان کی شہادت کے بعد گھر اور مسجد کے درمیان واقع جگہ میں دفن کیا گیا۔ کچھ تاریخ نگاروں کا کہنا ہے کہ دونوں امام اسی گھر میں دفن کئے گئے جس میں ان کو خانہ قید کیا گیا تھا۔ ان اماموں کی قبروں کے علاوہ یہاں امام علی نقی کی بہن حضرت حکیمہ خاتون اور بارہویں امام حضرت مہدی کی والدہ ماجدہ حضرت نرجس خاتون کی قبریں بھی موجود ہیں۔

ان قبروں پر ایک عرصہ تک صرف چھوٹے چھوٹے علامتی روضے بنے رہے لیکن 1868 میں ایرانی فرماں رواں احمد شاہ قاچار نے دونوں اماموں کے روضوں کو ایک حسین وجمیل شکل دی۔ اسکے بعد 1905 میں اس روضے پر شاندار سنہری گنبد تعمیر کیا گیا۔ اس گنبد کی تعمیر میں سونے کی 72000 اینٹیں استعمال کی گئیں تھیں۔ اور روضے پر نیلے رنگ کے ٹائلس سے مختلف

ڈیزائین بنا کر بہترین سجاوٹ کی گئی تھی۔20 میٹر کی گولائی اور 68 میٹر کی اونچائی والا یہ حسین گنبد سامرہ شہر کی پہچان بن گیا تھا لیکن اسلام کے دشمنوں اور آل رسول سے بغض رکھنے والے کچھ دہشت پسندوں نے سامرہ کے اس حسین روضے کو ایک گہری سازش کے تحت 2006 میں شہید کر دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ 22 فروری 2006 کو صبح سات بجے کے قریب عراقی فوج کی وردی میں ملبوس کچھ دہشت پسند روضے میں گھسے اور انھوں نے وہاں موجود گارڈوں کو پکڑ لیا اور اس کے بعد دھماکہ خیز مادہ لگا کر اس خوبصورت سنہری گنبد کو اڑا دیا جس پر اہل سامرہ کو بہت ناز تھا۔ اس حملے کے ڈیڑھ سال بعد 13 جون 2007 کو ایک بار پھر القاعدہ کے دہشت پسندوں نے اس روضے پر حملہ کیا اور مارٹر توپ کے ذریعہ ان میناروں کو بھی شہید کر دیا جو پچھلے بلاسٹ میں شہید ہونے سے بچ گئے تھے۔

سامرہ میں شیعہ مسلمانوں کی آبادی بالکل نہیں ہے اس لئے ان روضوں کی دیکھ بھال اور انتظام وانصرام کی ذمہ داری صدیوں سے مقامی سنیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس روضے پر آنے والے ہزاروں زائرین کی طرف سے چڑھائے جانے والی بھاری رقوم کی وجہ سے یہاں کے گروہوں میں رسہ کشی بھی چل رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس روضے پر حملہ کرنے کی سازش کرنے والوں میں سنیوں کا وہ گروپ شامل تھا جو روضے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کا خواہش مند تھا۔

اب اس روضے کی تعمیر نو اور حفاظت کی ذمہ داری کو حضرت سیستانی کے آفس کی نگرانی میں دے دیا گیا ہے۔ تعمیر کا کام بڑی حد تک مکمل ہو چکا ہے اور حفاظتی انتظامات نہایت چاق و چوبند ہیں۔ روضے کی حفاظت کے پیش نظر کسی بھی گاڑی کو روضے کی طرف جانے والی سڑک پر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ گاڑیوں کو کافی دور پر واقع پارکنگ ایریا میں کھڑا کرنا پڑتا ہے اور اس کے بعد پیدل اندر روضے پر جانا پڑتا ہے البتہ معذوروں، بوڑھوں اور عورتوں کے لئے بسوں

اور کاروں کی پارکنگ سے اندر روضے کے پھاٹک تک جانے کے لئے منتظمہ کمیٹی کی جانب سے خاص گاڑیاں چلتی ہیں جن میں کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا۔

ہم لوگ یہاں تقریبا چار گھنٹے میں پہنچے۔ یہاں بھی ہماری گاڑیوں کو روضے کے پھاٹک تک جانے کی اجازت مل گئی کیوں کہ کربلا کی منتظمہ کمیٹی نے یہاں پیغام بھیج دیا تھا کہ ہم لوگ جشن ربیع الشہادہ کے مہمان ہیں۔ روضے کے پھاٹک سے کچھ قبل ہی یہاں چائے کا ایک اسٹال لگا ہے جہاں آپ مفت میں ہر وقت چائے پی سکتے ہیں۔ ایک عارضی وضوخانہ بھی وہیں پر بنا ہوا ہے۔ مین گیٹ کے پاس ہی پرانے گنبد کا ملبہ ابھی تک پڑا ہوا ہے جس میں سے زائرین ابھی تک چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ لنچ کے وقت زائرین کو مفت میں کھانا بھی تقسیم ہوتا ہے۔

اسی روضے سے متصل وہ مبارک جگہ بھی ہے جہاں امام زمانہ نے اپنی زندگی کا کچھ عرصہ گزارا۔ یہ ایک خفیہ غار ہے جہاں اب لوگ سیڑھیوں سے اتر کر نیچے جاتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ روضے کے اندر داخل ہونے کے لئے بائیں طرف سے مرد اور داہنی طرف سے خواتین کے لئے راستہ ہے۔ روضہ میں دیواریں سبز ماربل سے بن رہی ہیں اور چھتوں میں شیشہ کی بہترین کاریگری کی جارہی ہے۔

یہاں بھی مومنین کے گریہ کی آوازیں کسی وقت تھمتی نہیں ہیں۔ یہاں کی دیواریں آل رسول کی مظلومیت کا قصہ رو رو کر بیان کرتی ہیں۔ سوچئے کہ کیسا ستم ڈھایا گیا اس رسول کے خانوادے پر جس نے دنیا کو سب سے بہترین مذہب دیا؟ اسی عظیم رسول کے گھرانے کے ایسے افراد یہاں دفن ہیں جن کو ان کی زندگی میں عباسی حکمرانوں نے خانہ قید کر کے رکھا اور شہادت کے بعد القاعدہ کے نام نہاد مسلمانوں نے اپنا نشانہ بنایا۔ ہم لوگ یہاں عصر کے وقت تک رہے نمازیں پڑھیں اور امام زمانہ کے غار کی زیارت کی اور یہاں تقسیم ہونے والا کھانا کھایا۔

بلد میں حاضری

سامرہ میں اپنے اماموں کی بارگاہ میں حاضری دینے کے بعد ہم لوگ بلد کے لئے روانہ ہوئے دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم بلد پہنچ گئے۔ یہاں امام علی نقی کے ایک صاحبزادے حضرت سید محمد کا روضہ ہے۔ بلد ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں پھلوں کے باغوں کی کثرت ہے۔ خاص طور یہاں کی انجیر بہت مشہور ہے۔

حضرت سید محمد کا روضہ کی تعمیر وتوسیع کا کام چل رہا ہے۔ اس روضے کی وجہ سے زائرین بلد میں کافی بڑی تعداد میں آتے ہیں اس لئے روضے کے آس پاس مختلف قسم کا تبرک بیچنے والوں کی لاتعداد دکانیں کھل گئی ہیں۔ یہاں خشک انجیر، پستے، بادام، کھجوریں اور چنے خوب بکتے ہیں۔

ہم لوگ جب پہنچے تو یہاں کی انتظامیہ کو ہم لوگوں کے آنے کی خبر پہلے سے مل چکی تھی۔ یہاں کے سب لوگ آغا سلطان سے اچھی طرح سے واقف تھے۔ ڈاکٹر رضا بھی یہاں پہلے آچکے تھے اس لئے ان کو بھی لوگ خوب جانتے ہیں۔ ان سے ملنے کے لئے تو مریض بھی آنے لگے اور ایسا لگنے لگا کہ جیسے مینجمنٹ کمیٹی کے دفتر میں ہی ایک چھوٹی سی کلینک کھل گئی ہو۔

بلد کے لوگ نہایت محبت کرنے والے لوگ تھے۔ اس قدر خاطر اور تواضع کی کہ ہم سب شرمندہ تھے شائد اس خاطر داری کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں کے کچھ لوگوں کی آغا سلطان نے بنگلور میں کافی آؤ بھگت کی تھی۔ ہم لوگوں نے یہیں مغرب عشا کی نماز پڑھی۔ شام کو یہاں کی دوکانوں سے خشک میوے خریدے۔ رات کے کھانے اور قیام کا انتظام یہاں کی انتظامیہ کی طرف سے کیا گیا۔ ہم لوگ بہت چین سے ائیر کنڈیشنڈ مہمان خانے میں سوئے۔ صبح کو ان لوگوں نے اس قدر شاندار ناشتہ کا اہتمام کیا کہ ہم لوگ شرمندہ ہو گئے۔ خیر اہل بلد کی زبردست مہمان نوازی کے گھرے نقوش لئے ہم لوگ بلد سے بغداد کے لئے روانہ ہوئے۔

ساتویں امام کی بارگاہ میں

بلد سے صبح آٹھ بجے ہم لوگ بغداد کے لئے روانہ ہوئے اور دو گھنٹے میں یہ سفر طئے کر کے ہم لوگ اپنے امام کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ بغداد کے اس علاقہ کو کاظمیہ ڈسٹرکٹ کہا جاتا ہے۔ اس علاقہ کا نام امام موسیٰ کاظم کے روضے کی وجہ سے کاظمیہ پڑا ہے۔ یہاں امام موسیٰ کاظم اور ان کے پوتے نویں امام حضرت محمد تقی کی قبریں ہے۔ بغداد شہر میں شمال یا مغرب کی طرف سے آنے والوں کو دور سے ہی امام موسیٰ کاظم کے روضے کے خوبصورت مینار اور گنبد نظر آنے لگتے ہیں۔ آج ان کے عقیدت مندوں نے ان کے روضے پر سونے چاندی کے انبار لگا دئے لیکن اس امام کو بھی دوسرے اماموں کی طرح بہت زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ امام جعفر صادق نے اپنے عہد میں علم کے ایسے دریا بہائے کہ ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگرد اسلامی دنیا کے سب سے بڑے اسکالرز کہلائے۔

حضرت امام جعفر کے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل بھی اپنے والد کی طرح علم وکمال کی منزلوں پر فائز تھے لیکن اپنے والد کی زندگی میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہ اللہ کی مرضی سے امامت کے درجہ پر فائز نہ ہو سکے۔ امام جعفر صادق کی شہادت کے بعد ان کے دوسرے صاحبزادے امام موسیٰ کاظم کو امامت ملی لیکن چوں کہ بہت سے لوگ حضرت اسمٰعیل کے علم وفضل سے بہت متاثر تھے اس لئے انھوں نے امام موسیٰ کاظم کی امامت کو نہیں مانا بلکہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد کو امام ماننے لگے اس طرح اسمٰعیلی فرقہ وجود میں آ گیا۔ امام موسی کاظم کو اپنے گھر کے لوگوں سے ہی اذیت کا سامنا کرنا پڑا ان کے ایک بھتیجے علی ابن اسمٰعیل نے خلیفہ ہارون رشید تک امام کے بارے میں جھوٹی اور من گڑھنت خبریں پہنچائیں اور امام کی گرفتاری کی راہ ہموار کی۔ ہمارے اس امام کو اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ جیل میں گزارنا پڑا اور زندگی کے آخری لمحوں تک ان کو

زنداں سے رہائی نہیں ملی۔اس مظلوم امام کو جیل میں ہی زہر دے کر شہید کیا گیا۔ ان کی
شہادت کے بعد ان کے جسم سے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹ کر اتاری گئیں۔اتنا ہی نہیں خلیفہ
کے حکم سے ان کی لاش کو دریائے دجلہ کے ایک پل پر رکھ دیا گیا اور شہر کے لوگوں میں اعلان کیا
گیا کہ وہ یہ دیکھنے کے لئے آئیں کہ حضرت موسیٰ کاظم اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں۔اس کے
بعد امام کو بغداد کے اس قبرستان میں دفن کیا گیا جو بنی ہاشم کے لوگوں اور قریش کے علما کے لئے
خلیفہ ہارون رشید نے مخصوص کر دیا تھا۔حضرت موسیٰ کاظم کی تدفین کے بعد یہ قبرستان ان کے
چاہنے والوں کے لئے ایک زیارت گاہ میں تبدیل ہو گیا۔

امام موسی کاظم کے علاوہ یہاں نویں امام حضرت محمد تقی کی قبر مبارک بھی ہے۔جیسا کہ سب
لوگوں کو معلوم ہے عباسی خلیفہ مامون نے پیغمبر حضرت محمد کی یہ حدیث سن رکھی تھی کہ ان کے
بارہ جانشین ہوں گے۔اس لئے اس نے پیغمبر کا جانشین اپنے گھر میں پیدا کروانے کی غرض
سے اپنی بیٹی ام الفضل کی کی شادی امام محمد تقی سے کر دی لیکن اللہ کی مرضی کے آگے کس کی چل
سکتی ہے؟ ام الفضل کے بطن سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔امام نے دوسری شادی صحابیٔ
رسول حضرت عمار یاسر کے خاندان سے تعلق رکھنے والی حضرت سبیکا سے مدینے میں کر لی
اس بات سے ام الفضل بہت ناراض رہی اور امام کی جان لینے کے درپے رہی۔مامون کی
موت کے بعد جب اس کے بھائی معتصم نے عنان حکومت سنبھالی تو ام الفضل نے اپنے چچا
کے ساتھ مل کر امام کو زہر دغا دے کر شہید کر دیا۔امام کو اپنے دادا حضرت موسیٰ کاظم کی قبر کے
پاس دفن کیا گیا اور اس طرح شہر بغداد کو خاندان رسالت کے دو آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
منور کر گئے۔

روضۂ کاظمین کی تاریخ

امام جعفر صادق کے بیٹے حضرت امام موسیٰ کو نہ صرف غیروں سے تکالیف اٹھانا پڑیں بلکہ ان کو
اپنوں سے بھی تکلیفیں ملیں لیکن انھوں نے کبھی غصہ کا اظہار نہیں کیا اور اپنے غصہ کو پیتے رہے۔
عربی زبان میں غصہ پی جانے والے کو کاظم کہتے ہیں اس لئے امام کا ایک لقب کاظم ہو گیا۔اس
کے علاوہ ان کو عبد الصالح، باب الوائج، ابوالحسن اور ابو ابراہیم کے القاب سے بھی یاد کیا جاتا
ہے۔ان کے روضے کی تاریخ کے بارے میں زیادہ تفصیل سے نہیں ملتا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ
امام محمد تقی کی تدفین کے بعد اس جگہ کو لوگ روضہ کاظمین یعنی دو غصہ پی جانے والوں کا روضہ
کہنے لگے کیوں کہ دونوں نے اپنے غصہ کو پی پی کر اپنی امامت کا زمانہ گزارا۔

تاریخی حوالوں میں ملتا ہے کہ بویہ قبیلے کے ایک سردار معز الدولہ نے جو عباسی خلافت کا ایک
گورنر تھا عباسیوں کے ایک نابینا خلیفہ مستعکفی کے بیٹے المقتدر کو مسند اقتدار پر بٹھا کر حکومت
کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔معز الدولہ آل رسول کے چاہنے والوں میں تھا، اس کے
زمانے میں امام موسیٰ کاظم کے روضے کی دیکھ بھال خوب ہوئی۔معزل الدولہ کے زمانے میں
ہی امام حسین کی یاد میں دس دن تک کھلے عام عزاداری کا سلسلہ شروع ہوا اور کربلا کے واقعہ کی
سچائی عوام کے سامنے کھل کر پہنچنے لگی جس کو بنو امیہ کے طرف داروں نے چھپا کر رکھا تھا۔اسی
زمانے میں شیعہ فقہ کی کتابوں کی اشاعت بھی ہو سکی۔

بغداد کی بدقسمتی یہ رہی کہ یہاں اکثر شیعہ سنی فسادات بھی ہوئے جس میں دونوں اماموں کے
روضوں کو نقصان پہنچا۔1051 میں بغداد میں اس وقت شیعہ سنی تنازعہ پیدا ہو گیا جب شیعہ
فرقہ کے لوگوں نے شہر کے دروازے پر حضرت علی کی ولایت کا اعلان لکھ دیا۔اس پر ایک سنی
رہنما نے اعتراض کیا تو اس کا قتل ہو گیا۔اس قتل کے بعد شہر میں تناؤ ہو گیا اور سنی رہنما کی تدفین

میں شرکت کر کے لوٹنے والی بھیڑ نے شیعوں پر حملے شروع کر دئے۔ ان لوگوں نے امام موسیٰ کاظم کے روضے کو بری طرح لوٹا اور اس میں آگ بھی لگا دی جس کی وجہ سے پورا روضہ تباہ ہو گیا۔ اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد بویہ قبیلے کو سلجوق سلطان نے تخت سے محروم کر دیا۔ ہر چند یہ لوگ بخارہ کے حنفی سنی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان لوگوں نے امام کے روضے کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ کہا جاتا ہے کہ سلجوقی بادشاہ سلطان ملک شاہ نے 1086 میں اس روضے کی تعمیر کروائی

1184 میں بغداد کا سفر کرنے والے ابن جبیر نام کے ایک سیاح نے بھی اپنے سفر نامہ میں امام موسیٰ کاظم کے روضے کا ذکر کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی یہ روضہ بغداد کی سب سے قابل ذکر عمارتوں میں سے ایک تھا۔

اس کے ایک سو سال بعد پھر سے ایک بار روضے میں کسی نے آگ لگا دی یا کسی حادثہ کی وجہ سے روضہ کی عمارت جل گئی اس کی تفصیل تو نہیں ملتی لیکن اس وقت کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ شیعوں کے لئے بہت سخت تھا۔ لوگ اپنے کو شیعہ کہنے سے ڈرتے تھے۔ ان کو شدید مصائب کا سامنا تھا یہاں تک کہ وہ امام موسیٰ کاظم کے روضے کی زیارت کے لئے چھپ چھپ کر جانے پر مجبور تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر شیعوں کو قتل کر دیا جانا عام سی بات تھی ایسے ہی دور میں عباسیوں کی موت کا پیغام آ گیا۔

1258 میں ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کر دیا اور اس شہر میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ اس کی افواج نے کاظمین کو بھی تاراج کیا۔ حالانکہ ہلاکو خان نے پہلے ہی سے کہہ دیا تھا کہ کربلا اور نجف سمیت سب ہی شیعہ مراکز کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ منگول فوجوں نے کربلا اور نجف کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا لیکن امام موسی کاظم کا روضہ انھوں نے برباد کر دیا۔ غالباً یہ کام انھوں نے انجانے میں کیا۔ اصل میں ہلاکو خان کو بغدا پر حملہ کرنے کی دعوت عباسی خلیفہ

مستعصم کے وزیر معید الدین الکامیہ نے دی تھی اور چوں کہ معید الدین آل رسول سے محبت کرتا تھا اس لئے اس نے ہلاکو خان سے پہلے ہی اس بات کا وعدہ کروا لیا تھا کہ اس کی فوجیں آل رسول کی مزارات کی بے حرمتی نہیں کریں گی لیکن منگول فوجیں بغداد کو جب تباہ کرنے کے لئے نکلیں تو پھر ایک طوفان بے تمیز کی طرح ہر چیز کو تباہ کر گئیں۔ تاریخی حوالوں میں ملتا ہے کہ جب معید الدین کو ہلاکو خان نے بغداد میں اپنا نائب مقرر کر دیا تو اس نے سب سے پہلے کسی عمارت کو تعمیر کروایا تو وہ کاظمین کا روضہ تھا۔ 1339 میں بغداد کا سفر کرنے والے ایک سیاح مصطفوی نے اپنی یادداشت میں امام موسیٰ کاظم اور حضرت محمد تقی کے روضوں کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان روضوں کی پرانی شان وشوکت پھر سے بحال ہو گئی تھی۔ ہلاکوں خان کی آل اولاد نے 82 برس تک بغداد پر حکمرانی کی اس عرصہ میں منگولوں کی فوج مسلمان ہو چکی تھی۔ 1340 میں منگولوں کے ایک قبیلے جولائر کے ایک سردار شیخ حسن بزرگ نے ہلاکوں خان کے جانشینوں کو بے دخل کر دیا۔ اس کے پچاس برس بعد تیمور نے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا اور بغداد شہر پر اس قدر آگ برسائی کہ پورا شہر تباہ ہو گیا لیکن تیمور کی افواج نے مسجدوں، مدرسوں اور مسافر خانوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ تیمور نے علما اور سادات کو بھی عام معافی دئے جانے کا اعلان کیا۔ اس نے ولائر قبیلے کا خاتمہ ہی نہیں کیا بلکہ بغداد کو لاشوں کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ لاشوں سے اٹھنے والا تعفن اس قدر زیادہ تھا کہ تیمور شہر میں قیام نہیں کر سکا اور جاتے وقت بغداد کی تعمیر نو کا حکم دے کر گیا۔ اس طرح بغداد پھر سے ایک بار آباد ہوا۔ تیمور کے انتقال کے بعد مختلف قبیلوں کے لوگ بغداد پر حکومت کرتے رہے۔ آخر کار 1508 میں ایران کے شیعہ بادشاہ اسمٰعیل صفوی نے بغداد پر قبضہ کر لیا اسی کے زمانے امام موسیٰ کاظم کے روضے پر وہ شاندار گنبد بنے جو آج تک بغداد کی شان بنے ہوئے ہیں۔

بغداد میں کچھ گھنٹے

آج بغداد دنیا کے سب سے خطرناک شہروں میں سے ایک ہے۔ ملک الموت ہر وقت یہاں موجود رہتا ہے اور عراقی القاعدہ کے روپ میں شیطان کی اولادیں بے گناہوں کا خون بہانے سے ایک دن باز نہیں رہتیں۔ اللہ، رسول اور اسلام کے دشمن ان دہشت پسندوں کی وجہ سے یہاں موت کے علاوہ ہر چیز مہنگی ہے۔

جب ہم لوگ کاروں کے ذریعہ کاظمیہ پہنچے تو یہاں سخت پہرا تھا۔ کاظمیہ شروع ہونے سے پہلے ہی پولس کی جانچ چوکیوں پر کار کو روکا جانے لگا لیکن ہمارے ساتھ کربلا کے جو کارکنان آئے تھے وہ سب کو عربی میں بتاتے رہے کہ ہم لوگ کون ہیں اور کیوں آئے ہیں۔ پھر ہم اس جگہ پر پہنچ گئے جہاں سے آگے جانے کی کسی گاڑی کو اجازت نہیں ہے۔ بغداد تو ویسے بھی دہشت پسندوں کی کالی کرتوت کا محور بنا ہوا ہے اس لئے یہاں سیکورٹی کے انتظامات بہت سخت تھے۔ روضے پر کسی طرح کا حملہ نہ ہو اس لئے تقریباً ایک کلومیٹر پہلے ہی تمام گاڑیوں کو روک دیا جاتا ہے اور تمام زائرین پیدل چل کر روضے تک پہنچتے ہیں۔ صرف ضعیف اور ناتواں زائرین کو لے جانے والی گاڑیوں کے روضے کے پاس تک جانے دیا جاتا ہے۔ بہت سی خواتین افغانہ نام کی ہاتھ سے ٹھیلی جانے والی گاڑی میں بھی سفر کرتی ہیں۔ یہاں بھی ہم لوگوں کی گاڑی کو روضے کے قریب لے جانے کی اجازت مل گئی اور ہم باب المراد کے بالکل نزدیک اترے اور پھر دیوانہ وار اپنے امام کے روضے کے اندر پہنچ گئے یہاں آج بھیڑ بھی بہت تھی کیوں کہ کچھ ہی دیر میں جمعہ کی نماز ہونے والی تھی۔ اسی بھیڑ میں ہم سب لوگ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ میں نے امام کے روضے پر حاضری دی ضریح کو بوسہ دیا۔ یہاں تعمیر کا کام بہت بڑے پیمانے پر چل رہا ہے۔ روضے کے اندر سبز ماربل کی دیواریں بنائی جا رہی ہیں اور چھت پر شیشہ کے

چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے حسین مینا کاری کی جا رہی ہے۔ کئی جگہ پر بانس بلیاں لگی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے آنے جانے میں تھوڑی دقت تھی۔ باہر شدید گرمی تھی۔ دھوپ اس قدر تیز تھی زمین تو زمین قالین پر پیر رکھنا بھی ناممکن ہو رہا تھا۔ اس لئے زیادہ تر زائرین روضے کے ائیر کنڈیشنڈ ہال میں عبادت کر رہے تھے اس کی وجہ سے اب کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ بہت کوششوں کے بعد مجھ کو ایک کونے میں جگہ مل گئی جہاں میں کچھ دیر کے لئے بیٹھ گیا۔ اسی درمیان دو نوجوان بھی آکر پہلو میں بیٹھ گئے اور ہندوستان کے بارے میں مختلف سوالات کرنے لگے۔

میرے پاس میں ہی دو بوڑھے لوگ بھی بیٹھے تھے جن میں سے ایک دوسرے کو قرآن پڑھا رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر اچھا لگا کہ اس عمر میں آنے کے بعد بھی ایک شخص قرآن کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ شائد میرے لئے یہ ایک پیغام تھا کہ علم حاصل کرنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی اور انسان کو ماں کی آغوش سے لے کر قبر میں اتارے جانے تک علم حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

کچھ دیر بعد اذان کی آواز آئی اور روضے کے صحن میں نمازیوں کی صفیں بننے لگیں۔ شدید دھوپ میں نماز پڑھنا بہت مشکل تھا لیکن پھر بھی اللہ کے دربار میں سربسجود ہونے کے لئے فرزندان توحید جوق در جوق پہنچ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں سارا صحن بھر گیا۔ آگے مرد تھے اور پیچھے خواتین کی صفیں بن گئی تھیں۔ مجھے عراق والوں کی یہ بات بہت اچھی لگتی کہ یہاں عورتیں مسجدوں میں نماز جماعت ادا کرنے کے لئے پوری طرح آزاد ہیں۔

بغداد میں انقلابی شیعہ رہنما مقتدیٰ صدر کے ماننے والے بہت ہیں چاروں طرف ان کے بڑے بڑے پوسٹر نظر آتے ہیں۔ نماز جمعہ کی امامت کرنے والے پیش امام بھی ان ہی کے کوئی ساتھی تھے ان کے جوشیلے خطبے اور عوام کے نعروں سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کے ان مسائل پر روشنی ڈال رہے ہیں جن سے صرف عراق ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمان آج

پریشانیوں میں گھرے ہیں۔ یہاں نمازیوں کوشدید گرمی سے نجات دینے کے لئے پانی کی
پھوار چھوڑنے والے پنکھے MIst Fans بھی لگے تھے لیکن ان کی ٹھنڈی اور فرحت بخش
ہوا بھی لو کے گرم جھکڑوں سے نجات دلوانے میں کامیاب نہیں تھی۔ اس لئے کئی نوجوان اپنے
کاندھوں پر بڑے بڑے اسپرینکلر لئے ہوئے گھوم رہے تھے جو نمازیوں پر پانی کی ہلکی ہلکی
پھوار چھوڑکر ان کے کپڑوں کو نم کر رہے تھے۔

نماز جمعہ کے بعد میں باہر نکلا اور کار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ روضے کے آس پاس سونے کے
زیورات بیچنے والوں کی ان گنت دکانیں ہیں۔ مٹھائی اور چھوٹے چھوٹے گفٹ آئٹم بیچنے
والوں کے خوانچے دور تک لگے ہیں۔ کچھ دیر بعد آغا سلطان کے ایک دوست مسٹر مجید سے ملنے
کے لئے ان کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجید صاحب کے گھر میں بہت سے پیڑ لگے تھے
کھجور کے بھی کئی پیڑ تھے جن کے نیچے کھجوریں پڑی تھیں، ان کھجوروں کو چکھ کر بہت اچھا لگا
کیوں کہ تھوڑی سی کچی کھجور کا مزہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ مجید صاحب اور ان کی اہلیہ نے بہت
ہی شاندار دعوت کی۔ یہاں دسترخوان پر بڑی بڑی مچھلیاں بھون کر سجائی گئی تھیں۔ جن میں
نمک کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ مجید صاحب نے کہا کہ ہندوستانی لوگ تو صرف مصالحوں کا مزہ
لیتے ہیں ان کو صرف مچھلی یا صرف مرغ کا مزہ کہاں معلوم؟ ان کی دعوت کا لطف لینے کے بعد ہم
سب لوگوں نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر کربلا کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں کے استے میں بھی
ان مومنین کے لئے سبیلوں کا انتظام کیا تھا جو کربلا کی طرف پیدل جا رہے تھے۔ جیسا کہ میں
کہہ چکا ہوں کہ عراقی لوگ پندرہ شعبان کے جشن میں شرکت کے لئے پیدل چل کر کربلا تک
جاتے ہیں۔ سو کلومیٹر لمبے راستے پر عورتیں اور بچے اپنے بیگ اٹھائے ہوئے کربلا کی طرف
رواں دواں دکھائی پڑے رہے تھے۔ رات ساڑھے آٹھ بجے ہم لوگ پھر کربلا پہنچ
گئے۔ ہوٹل الرایات میں یہ ہماری آخری رات تھی۔

مولا علی کی بارگاہ میں

صبح سویرے ہم لوگوں نے اپنا سارا سامان پیک کیا۔ جس کو آغا سلطان نے اپنی دیکھ ریکھ میں
دوسرے ہوٹل کے لئے بھجوا دیا۔ ہم لوگ ساڑھے نو بجے کے قریب نجف اشرف کے لئے روانہ
ہوئے۔ پروفیسر عین الحسن کو نجف سے سیدھے ہی ہندوستان کے لئے روانہ ہونا تھا اس لئے
انھوں نے اپنا سارا سامان اپنے ساتھ لیا جب کہ ہم لوگوں نے صرف ایک ایک بیگ لے لیا
اور پھر ہماری گاڑیاں نجف کے لئے روانہ ہو گئیں۔ راستے بھر مومنین کے جتھے کربلا کی طرف
آتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کربلا کی طرف آنے والے راستے پر کافی بھیڑ تھی لیکن نجف کی
طرف جانے والے راستے پر اتنی بھیڑ نہیں تھی۔ نجف کے راستے میں جو کلومیٹر بتانے کے لئے
جو بورڈ لگے تھے ان پر لکھا ہوتا تھا السلام علیک یا امیر المومنین اور نیچے لکھا ہوتا تھا نجف 90 کلو
میٹر۔ سڑک کے دونوں طرف دور تک آبادی ہے اور جہاں آبادی نہیں ہے وہاں پر موکبوں کے
ذریعہ لگائی گئی سبیلوں نے آبادی کا احساس کروا رکھا تھا۔

تکان کے سبب میری آنکھ لگ گئی لیکن میں اس وقت چونک پڑا جب ہماری گاڑی کے
ڈرائیور نے کہا السلام علیک یا ابوالحسن میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ہمارے دائیں ہاتھ کی
طرف مولا علی کا روضہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے مولا کی خدمت میں آنسوؤں میں ڈوبا سلام پیش کیا
اور پھر ایک سکنڈ کے لئے بھی روضے سے نظر نہیں ہٹائی۔ میں بس ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، رفتہ
رفتہ نجف کی بلڈنگوں اور مکانوں کی وجہ سے روضہ دکھائی دینا بند ہو گیا۔ نجف کی
آبادی 2008 کی مردم شماری کے مطابق 560,000 ہے اور یہاں کی دوکانیں کربلا کی
دکانوں کی بہ نسبت زیادہ سجی ہوئی لگ رہی تھیں۔ مختلف راستوں اور سیکورٹی کے مراحل سے
گزرتے ہوئے ہم نجف کی حدود میں داخل ہوئے۔ یہاں ہم لوگوں کو سب سے پہلے آیت

اللہ العظمیٰ سید علی سیستانی کے گھر پر جانا تھا۔ نجف میں دوسرے شہروں سے آنے والی گاڑیوں کی بہت سخت چیکنگ ہوتی ہے اور پوری چھان بین کے بعد ہی گاڑی کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت ملتی ہے۔ ہم لوگوں کی گاڑی بھی کافی دیر روک کر رکھی گئی پھر سیکورٹی کی جانب سے کلیئرنس ملنے کے بعد ہم لوگ نجف اشرف میں داخل ہوئے۔ مجھے سیکورٹی کا یہ انتظام بہت اچھا لگا حضرت علی کی بارگاہ میں داخل ہونے کے لئے کم از کم اتنی سخت سیکورٹی تو عام دنوں میں بھی ہونا چاہئے۔

ہم لوگوں کی گاڑی ایک جگہ پر جا کر رکی تو دیکھا کہ بائیں جانب مولائے کائنات کا روضہ ہے میں نے اپنے آقا کو سلام پیش کیا۔ اپنے روضے پر حاضر ہونے کا شرف بخشنے کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اتنے میں ہماری میزبانی کے لئے مولانا علی عباس زین پوری صاحب تشریف لے آئے جو یہاں کے حوزہ علمیہ میں زیر تعلیم ہیں۔ ان کے آجانے کے بعد ہم لوگوں کو عربی نہ جاننے کی وجہ سے جو تکلیف ہو رہی تھی وہ دور ہوگئی اور ہم لوگوں کی گاڑی کو روضے کے اس دروازے کے قریب تک لے جانے کی اجازت مل گئی جس کو باب القبلہ کہا جاتا ہے۔

ہمارے بیگ ہوٹل کے لئے بھیج دئے گئے اور ہم آیت اللہ العظمیٰ سید علی سیستانی سے ملاقات کے لئے ان کے گھر کی طرف چل دئے جو روضے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک پتلی سی گلی میں واقع ہے۔ اس گلی میں سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے ہیں۔ مومنین بڑی تعداد میں گلی کے باہر اس امید میں کھڑے تھے کہ آیت اللہ سیستانی کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ ہم لوگوں نے پہلے سے وقت لیا تھا لیکن یہاں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی پھر بھی ہم سب کو آیت اللہ العظمیٰ سے ملاقات کا شرف ملا۔ ان کے گھر کی سادگی اور ان کے طرز زندگی سے میں بہت متاثر ہوا۔ وہ عالم دین جس کے ہاتھوں کروڑوں روپئے کی رقم دنیا بھر کے فلاحی اداروں میں ہر سال بھیجی جاتی ہو۔ اس کی اپنی زندگی بالکل سادہ تھی۔ معمولی در و دیوار والا گھر، کمرے میں زمین کا فرش، جس پر

معمولی قالین اور گدے پڑے تھے، ہر مہمان کی تواضع یہاں صرف سادی چائے سے کی جا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے استکانوں میں بغیر دودھ کی چائے بہت خوش مزہ تھی۔ یہ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگا۔ اتنے بڑے عالم دین کے گھر کی سادگی دیکھ کر دل کو بہت سکون ملا۔ مجھے ایک طالب علم نے بتایا کہ آیت اللہ سیستانی جو عبا پہنے تھے وہ ان کے بدن پر گزشتہ بارہ سال سے ہے اور اتنی پرانی ہو جانے کے باوجود اس کو انھوں نے بدلا نہیں۔ اصل میں یہ سب باتیں علما کی شان میں اضافہ کرتی ہیں۔

موصوف نے ہم لوگوں سے تقریباً 45 منٹ تک بات کی اور ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق کئی اہم باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ علم حاصل کریں اور ہر فیلڈ میں ایسا کام کریں کہ دوسری قوموں کے لوگ مسلمانوں کے قریب آنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے غیر مسلم حضرات کے دلوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ مسلمان بیرونی حملہ آوروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا ایک طبقہ مسلمانوں سے نفرت کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نفرت مٹانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنی آنے والی نسل کو دنیاوی علوم کی بھرپور تعلیم دلوائیں اور ایسا ہو کہ اگلے پچاس برس میں ہندوستان کے ہر شعبۂ حیات میں مسلمان سرفہرست نظر آئی۔ جب آپ کی نسل میں بہترین ڈاکٹرس ہوں گے، بہترین انجینئرس ہوں گے اور بہترین افسر ہوں گے تو خود بخود لوگ آپ کے قریب آئیں گے اور آپ ان کی خدمت کر کے ان کے دلوں میں موجود نفرت کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوں گے۔ آیت اللہ العظمیٰ سیستانی نے کہا کہ مسلمانوں کے درمیان نفاق پھیلانے والے لوگوں سے سختی سے نمٹنے کی ضرورت ہے اور جو لوگ شیعہ اور سنی فرقہ کے اختلافات کو ہوا دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنی صفوں سے دور رکھنا چاہئے۔ گفتگو ختم ہونے کے بعد آیت اللہ العظمیٰ سیستانی صاحب نے وفد کے سب ہی ممبروں کو در نجف کی انگوٹھیاں تحفے میں دیں۔

مولائے کائنات کے در پر حاضری

اس کے بعد ہم لوگ روضۂ امیر المومنین کی زیارت کے لئے روضے کے اندر پہنچ گئے۔ وہاں اس وقت بھی زبردست بھیڑ تھی۔ ہمارے ساتھ جتنے بھی لوگ آئے تھے وہ لوگ پہلے بھی کئی بار زیارت سے مشرف ہو چکے تھے صرف میں اور عین الحسن پہلی بار آئے تھے اس لئے ہم مولا کی زیارت کے لئے زیادہ بیتاب تھے۔ ہم آیت اللہ سیستانی کے مکان سے نکل کر دیوانہ وار اس چوکھٹ کی طرف بڑھے جس کو فضیلتوں نے اپنا ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔ ہم لوگ کلاک ٹاور والے گیٹ کے طرف سے اندر روضے میں داخل ہوئے اور مجمع میں سے ہوتے ہوئے سیدھے اپنے مولا کی ضریح سے جا کر لپٹ گئے۔ میں نے اپنے مولا سے کچھ نہیں مانگا۔ بس ان کا شکریہ ادا کرتا رہا کہ انھوں نے مجھے اس بارگاہ میں داخل ہونے کی اجازت عطا کی۔ ظہر عصر کی نماز یہیں پڑھی اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک روضے میں ہی بیٹھا رہا۔

روضے سے باہر نکل کر میں ایک پتلی سی گلی سے ہوتا ہوا ہوٹل یسرب میں واقع اپنے کمرے میں پہنچا۔ حضرت علی کے روضے کے تینوں طرف ایک عظیم بازار قائم ہو چکا ہے۔ بیشمار دکانیں اور ہوٹل یہاں قائم ہیں ان کی وجہ سے سڑک پر سے روضہ دکھائی نہیں پڑتا ہے۔ صرف پشت کی طرف جو سڑک واقع ہے وہاں سے روضہ نظر آتا ہے۔ حرم کی پشت کی جانب توسیع کا کام چل رہا ہے۔ کسی زمانے میں اسی طرف آیت اللہ العظمیٰ خوئی کا مدرسہ تھا جس کو صدام حسین نے منہدم کروا دیا تھا۔ اب اس علاقے کو روضے کی توسیع کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

نجف ایک زمانے میں شیعوں کے علما کا مرکز تھا اور بعث پارٹی کی حکومت آنے سے قبل تک دنیا بھر کے شہروں سے شیعہ نوجوان یہیں آ کر علم دین حاصل کرتے تھے۔ ہمارے خاندان کے تمام علما نے نجف اشرف میں ہی دینی تعلیم حاصل کی تھی لیکن صدام حسین کی طرف سے لگاتار

مشکلات کھڑی کئے جانے کے باعث دنیا کے دوسرے ممالک سے آنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹنے لگی۔ 1978 میں امام خمینی کو نجف سے نکالے جانے کے بعد تو دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کو ہر وقت خفیہ پولس اور بعث پارٹی کی پولس کے سائے میں زندگی گزارنا پڑی طلبا کو وظیفہ ملنا مشکل کر دیا گیا۔ اس سختی کی وجہ سے آخر میں یہ نوبت آ گئی کہ مدارس بند کر دئے گئے۔ علما اپنے گھروں پر طلبا کو پڑھانے لگے اور وہ بھی حکومت کی سخت نگرانی کے درمیان۔ عراق کی حکومت کی اس سختی کی وجہ سے علم دین حاصل کرنے کے لئے شیعہ نوجوان نجف اشرف کے بجائے ایران کے مقدس شہر قم کا رخ کرنے لگے جہاں آسانیاں کافی تھیں اور طلبا کو وظیفہ دینے اور ان کے قیام کے بہتر انتظامات تھے۔

مجھے مولانا علی عباس زین پوری نے بتایا کہ اب یہاں کے حالات کافی بدل گئے ہیں اور علم دین حاصل کرنے کے لئے طلبا دنیا کے گوشے گوشے سے پھر یہاں آنے لگے ہیں لیکن نجف کے حوزہ علمیہ کا اپنا کوئی کیمپس نہیں ہے۔ مسجدوں اور امام باڑوں میں مختلف علما کلاس لیتے ہیں البتہ طلبا کو شہریہ یعنی اسکالرشپ دینے کا ایک مرکزی نظام موجود ہے جو آیت اللہ العظمیٰ سید علی سیستانی، آیت اللہ العظمیٰ سید بشیر نجفی، آیت العظمیٰ ریاض اور آیت اللہ العظمیٰ سید حکیم کی دیکھ ریکھ میں بحسن وخوبی چل رہا ہے۔ گو کہ یہاں ہندوستانی اور پاکستانی شیعہ نوجوان علم دین حاصل کرنے کے لئے اب آنے لگے ہیں لیکن ابھی بھی زیادہ تر نوجوان ایران جانے کو ہی ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ وہاں کے مدرسوں میں داخلہ مل جانے کے بعد اتنی اسکالرشپ ملنے لگتی ہے کہ طلبا اپنے اخراجات آسانی سے پورے کر سکیں۔ عراق میں ملنے والی اکالرشپ میں بھی گزارا ہو جاتا ہے لیکن یہاں ایران کا جیسا مربوط نظام نہیں ہے مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ نجف میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو عربی میں گفتگو کرنے پر کافی قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔

نجف اشرف کی تاریخ

کوفے سے صرف چار میل کے فاصلے پر واقع آج کا شہر نجف کسی زمانے میں عراق کا ایک چھوٹا سا غیر معروف اور غیر آباد علاقہ تھا۔ حالانکہ یہاں حضرت آدم اور حضرت نوح کی قبور پہلے سے موجود تھیں لیکن لوگ عام لوگ اس سے ناواقف تھے۔

نجف کا نام نجف کیوں پڑا اس کے بارے میں روایات میں ملتا ہے کہ جب حضرت نوح نے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک بڑی کشتی بنائی اور اس میں سوار ہو گئے تو ان کے ناخلف بیٹے نے ایک پہاڑ پر پناہ لی اور کشتی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور وہاں سے ایک دریا جاری ہو گیا۔ کئی صدیوں کے بعد یہ دریا خشک ہو گیا اور اس جگہ کو نے جف کہا جانے لگا جس کے معنی ہوتے ہیں خشک دریا۔ ویسے عربی میں نجف کا مطلب اونچا مقام ہوتا ہے

تاریخی حوالوں میں یہ بھی تحریر ہے کہ اس زمین پر زلزلے کے جھٹکے برابر آیا کرتے تھے اور زلزلے کے خوف سے یہاں کے باشندوں کی زندگی کافی غیر محفوظ تھی لیکن پیغمبر حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کے ساتھ جب یہاں وارد ہوئے تو ان کے قیام کے دوران زلزلے کے جھٹکے آنا بند ہو گئے۔ اس کے بعد دونوں باپ بیٹے دوسرے گاؤں میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد یہاں پر زلزلے کے جھٹکے محسوس کئے گئے۔ جب حضرت ابراہیم اپنے صاحبزادے کے ساتھ واپس آئے تو یہاں کے لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ لوگ اس علاقے میں آباد ہو جائیں۔ حضرت ابراہیم وہاں اس شرط پر رہنے کے لئے آمادہ ہو گئے کہ گاؤں کی پشت پر جو وادی ہے وہ ان کو کھیتی باڑی کے لئے دے دی جائے (اسی وادی کو آج وادئ سلام کہا جاتا ہے جہاں آج دنیا کا شائد سب سے بڑا قبرستان واقع ہے) حضرت ابراہیم

کی اس شرط پر گاؤں والے راضی ہو گئے حالانکہ حضرت اسحاقؑ نے اپنے والد سے کہا کہ یہ زمین نہ تو کھیتی کے لائق ہے نہ ہی زرعی پیداوار کے لئے موزوں ہے پھر بھی آپ یہاں رہنے پر کیوں آمادہ ہو گئے ہیں؟ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے وہیں قیام کرنے پر اصرار کرتے ہوئے کہا کہ آج یہاں کچھ نہیں ہے لیکن ایک دن ایسا آئے گا کہ یہاں ایک زیارت گاہ قائم ہوگی اور ایک روضہ بنے گا اور اس زمین میں دفن ہونے والے 70 ہزار لوگ بغیر کسی روک ٹوک کے جنت میں جائیں گے اور دوسروں کی مغفرت کا باعث بھی بنیں گے۔ حضرت ابراہیم کی یہ پیشین گوئی حضرت علی کے بارے میں تھی جنھوں نے اپنی تدفین کے لئے نجف کا انتخاب کیا تھا سن 40 ہجری میں رمضان کی 19 تاریخ کو حضرت علی کو مسجد کوفہ میں ایک خارجی عبدالرحمان ابن ملجم نے زخمی کر دیا اور 21 رمضان کو حضرت علی اپنے اللہ کے دربار میں پہنچ گئے۔ انھوں نے شہادت سے قبل اپنے بیٹوں حضرت امام حسن اور امام حسین کو بلایا اور بتایا کہ وہ جب جنازہ کوفہ کی سرحد پر پہنچ جائے تو وہ جلوس میت میں شامل تمام لوگوں کو واپس بھیج دیں اور صرف وہ دونوں حضرت علی کے تابوت کو پیچھے سے اٹھائیں اور آگے سے تابوت خود اٹھے گا۔ جہاں یہ تابوت جا کر رک جائے وہیں ان کی تدفین ہوگی۔ کچھ روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت علی نے کہا تھا کہ ان کی لاش کو ایک تابوت میں رکھ کر اونٹ پر رکھ دیا جائے اور جہاں اونٹ خود جا کر رک جائے وہیں ان کی قبر بنائی جائے اس طرح حضرت علی کا جنازہ کوفے کی سرحد سے نکل کر اس وادی میں پہنچا جہاں حضرت آدم اور حضرت نوح کی قبریں پہلے سے موجود تھیں۔ امام حسن اور امام حسین اپنے بابا کو دفن کر کے چلے آئے لیکن انھوں نے اپنے خاندان کے لوگوں کے علاوہ کسی کو نہیں بتایا کہ حضرت علی کہاں دفن ہیں۔ کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ حضرت علی کے دشمن ان کی قبر کی بے حرمتی بھی کر سکتے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اہل بیت رسول کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ حضرت علی کہاں دفن ہیں۔ 175 ہجری میں خلیفہ ہارون رشید شکار کھیلنے نکلا تو

اس نے اپنے شکاری کتوں کوایک ہرن کے پیچھے دوڑایا تو ہرن بھاگ کر ایک بلند مقام پر چڑھ گیا لیکن کتے اپنی جگہ پر ٹھیر گئے اور اس جگہ سے دور رہے۔ جیسے ہی ہرن نیچے اترا پھر شکاری کتے اس کی طرف دوڑے ہرن پھر اسی بلندی پر چڑھ گیا۔ ہارون رشید کی جانب سے لاکھ اکسانے کے باوجود کتے ہرن کی طرف نہیں بڑھے۔ اس بات پر حیران ہوکر ہارون نے آس پاس کے لوگوں سے اس جگہ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ حضرت علی کی قبر ہے اور یہاں اہلبیت رسول کے لوگ برابر آتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہارون رشید نے اس جگہ پر ایک روضہ بنائے جانے کا حکم دیا۔ حضرت علی کی قبر دریافت ہونے کی خبر ملتے ہی حضرت علی کے چاہنے والے دور دور سے آ کر یہاں آباد ہونے لگے۔

270 ہجری میں امام حسن کی نسل سے تعلق رکھنے والے محمد بن زید بن اسماعیل بن حسن بن زید بن حسن کو طبرستان کی پر حکومت کرنے کا موقع ملا انھوں نے حضرت علی کے روضے پر ایک شاندار عمارت قائم کروائی۔ انھوں نے گنبد بنوایا قلعہ کی جیسی دیواریں بنوائیں اور روضے پر 70 محرابیں بنوا کر اس کو خوبصورتی عطا کی۔

اس روضے کی زیارت کے کے لئے دور دور سے آنے والوں کی وجہ سے نجف رفتہ رفتہ عراق کے ایک اہم شہر میں بدل گیا۔ 977 عیسوی میں ایرانی نسل کے ایک حاکم عضدالدولہ فناخسرو نے حضرت علی کے روضے کو عالیشان شکل دی لیکن کچھ برسوں کے بعد اس کو آگ لگا دی گئی۔ بعد میں عمران بن شاہین نام کے ایک سردار نے امام کے روضے کی تعمیر کروائی اور ایک مسجد بھی وہاں پر تعمیر کروائی۔

چوتھی صدی ہجری میں بن قیس نام کے ایک خارجی حضرت علی کی قبر کھودنے کی کوشش کی۔ اس شخص کو تاریخ میں الفاسق کا لقب دیا گیا ہے۔ الفاسق کی اس حرکت کے بعد نجف شہر پر زبردست تباہی آئی اس کی فصیلیں شق ہوگئیں اور لوگوں کو یہاں سے بھاگنا پڑا۔

بویہ حکمرانوں کے عہد میں نجف اسلامی تعلیم کے ایک مرکز میں بھی تبدیل ہوا اور یہاں 1056 میں مشہور عالم دین اور ماہر دینیات شیخ ابوجعفر طوسی یہاں آ کر آباد ہوئے جن کو بغداد میں بہت سخت اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا وہاں ان کا کتب خانہ بھی جلا دیا گیا تھا۔ اسی زمانے میں دنیا بھر سے شیعہ نوجوان یہاں آ کر علم دین حاصل کرنے لگے اور نجف ایک بڑے علمی مرکز میں تبدیل ہوگیا۔ اسی وجہ سے یہاں سے بہت نامور علمائے کرام فارغ ہوکر نکلے اور انھوں نے شیعہ فرقہ کی تعلیمات کو دنیا میں عام کیا۔

کچھ عرصہ بعد نجف کے روضے میں آتشزنی کا واقعہ ہوا اور روضے کو بہت نقصان پہنچا۔ اس کے بعد 1086 عیسوی میں سلجوقی بادشاہ ملک شاہ نے اس روضے کی تعمیر پھر سے کروائی۔

508 ہجری یعنی گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں میں حضرت علی کے خانوادے کے ایک دشمن المشاشہ کو عراق اور بصرہ کی حکمرانی مل گئی اس وقت اس علاقے کو الجزائر کہا جاتا تھا۔ المشاشہ نے نجف اور کربلا میں زبردست تباہی پھیلائی اور دونوں جگہ روضوں کو منہدم کروادیا۔

اس کے بعد بویہ قبیلے کے مختلف وزیروں اور حاکموں اور ہمدانی سلسلے کے لوگوں نے بنی عباس کے ایسے لوگوں کے ساتھ مل کر جو حضرت علی کو دوست رکھتے تھے اس روضے کی تعمیر میں حصہ لیا۔ معروف سیاح اور تاریخ نگار ابن بطوطہ نے 727 ہجری میں نجف کا دورہ کیا اور بڑی تفصیل سے روضے کی خوبصورتی کا ذکر اپنے سفرنامے میں کیا۔ ابن بطوطہ نے نجف شہر، اس کے بازاروں اور مدرسوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے اور ان قیمتی سامانوں کا ذکر بھی کیا ہے جو اس نے روضے پر دیکھے۔ ابن بطوطہ نے مقدس روضے کی دیکھ ریکھ کرنے والوں اور زائرین کے ساتھ ان کے حسن سلوک کا ذکر بھی کیا ہے۔ اپنے سفرنامے میں انھوں نے اس خوبصورت جھاڑ کا ذکر بھی کیا ہے جو چھت سے لٹکا ہوا تھا۔ ابن بطوطہ کے مطابق ان دنوں حضرت آدم اور حضرت نوح کی قبروں پر الگ الگ گنبد بنے ہوئے تھے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ وہاں

بڑے بڑے برتنوں میں آب گلاب اور مشک کی خوشبو سے معطر پانی بھرا رہتا تھا اور زائرین روضے میں داخل ہونے سے قبل اپنے ہاتھ منھ اسی مہکتے ہوئے پانی سے دھوتے تھے۔

1304 عیسوی میں ہلاکو خان کے بیٹے غازان نے حضرت علی کے روضے کے درمیان میں ایک مسجد بنوائی۔اس کو مسجد راس کہا جاتا ہے یعنی سر والی مسجد۔امام جعفر صادق کے حوالے سے مورخین نے لکھا ہے کہ اسی جگہ پر امام حسین کا سر مبارک دفن کیا گیا تھا۔حالانکہ زیادہ تر روایتوں میں لکھا گیا ہے کہ امام حسین کا سر مبارک دمشق میں دفن ہے لیکن ایک روایت کے مطابق جب امام حسین کے سر کو کوفے سے دمشق لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں امام کے ایک چاہنے والے نے یہ سر غائب کر دیا اور اس کو امیر المومنین کے روضے کے قریب لا کر دفن کر دیا۔

1501 عیسوی میں ایران میں صفوی بادشاہوں کو اقتدار حاصل ہوا۔بادشاہ اسمٰعیل صفوی نے اس روضے کو حسین و جمیل شکل عطا کی۔صفوی خاندان نے 1736 تک ایران اور آس پاس کے ممالک پر حکمرانی کی اور اس دوران اس خانوادے نے کربلا اور نجف کے حسن میں اضافہ کیا۔اس خانوادے نے ہی ایران شیعیت کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا۔

1736 میں نادر شاہ نے صفوی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اس نے صفوی حکومت کی پالیسیوں سے انحراف کرتے ہوئے شیعہ و سنی کی مشترکہ حکومت قائم کی بلکہ مسلمانوں کا خلیفہ بننے کی فکر میں اس نے خود کو سنی کہنے سے بھی گریز نہیں کیا حالانکہ وہ ایک شیعہ خانوادے سے تعلق رکھتا تھا۔ سنیوں کا دل جیتنے کی فکر میں اس نے سیاسی فیصلے تو کئے لیکن امام حسین اور حضرت علی سے اپنی محبت کو اس نے کبھی نہیں چھپایا۔نادر شاہ اور اس کی بیوی رضیہ سلطان بیگم کی جانب سے بھی روضوں کی تزئین کاری میں ایک بڑی رقم خرچ کئے جانے کا تذکرہ تاریخوں میں جا بجا ملتا ہے۔جیسا کہ پچھلے صفحات میں لکھا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے بادشاہوں اور نوابوں نے بھی نجف اور کربلا کے روضوں کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ہندوستان کے صوبۂ اودھ کے شیعہ

فرمانروا نواب آصف الدولہ نے کوفے میں بہنے والے دریائے فرات سے سے نجف تک پانچ لاکھ چاندی کے سکوں کی لاگت سے ایک نہر بنوائی تھی۔یہ نہر انھوں نے آیت العظمیٰ سید دلدار علی غفراں ماب کی فرمائش پر بنوائی تھی۔چوں کہ اس زمانے میں نجف میں پانی کی بہت قلت تھی اور خود سید دلدار علی نجف اشرف میں کئی برس تک رہ چکے تھے اس لئے ان کو اندازہ تھا کہ وہاں نہر کتنی ضروری ہے۔یہ نہر 1793 میں بن کر تیار ہوئی۔عراق سے موصول ہونے والے تاریخی حوالوں میں اس کو نہر ہندیہ کہا گیا ہے۔

اس نہر بننے کے صرف گیارہ سال بعد 1804 میں نجف اور کربلا پر وہابیوں نے حملہ کر دیا۔ ان انتہا پسندوں نے کربلا اور نجف میں آل رسول کے روضوں کو زبردست نقصان پہنچایا کیوں کہ ان کے مکتب فکر کے مطابق روضہ بنانا بدعت ہے۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ انھوں نے جنت البقیع میں بھی جگر گوشۂ رسول حضرت فاطمہ زہرا کی قبر سمیت مختلف صحابیوں اور اماموں کے مزاروں کو برباد کیا۔ وہابیوں کے حملے میں اس نہر کو بھی تباہ کر دیا گیا جو نواب آصف الدولہ نے بنوائی تھی۔اس نہر کے بند ہو جانے کے بعد نجف میں پانی کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔کچھ عرصہ بعد جب ترکی کی خلافت عثمانیہ نے نجف اور کربلا کو وہابیوں سے پاک کیا تو روضوں کی تعمیر پھر سے ہوئی اور آصفی نہر کو پھر بنوانے کے لئے ہندوستان کے مرجع تقلید آیت اللہ العظمیٰ سید محمد نقوی نے اودھ کے حکمراں نواب محمد علی شاہ سے کہا کہ وہ دوبارہ نجف سے کربلا کے درمیان نہر کو جاری کروائیں جس کے لئے نواب نے انگریز ریزیڈنٹ کی معرفت 1839 میں تین لاکھ چاندی کے سکے اور پھر 1841 میں مزید ڈھائی لاکھ چاندی کے سکے بھیجے۔مجھے ایک صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اس نہر کو بہو بیگم والی نہر کے نام سے بھی لوگ پکارا کرتے تھے۔غالباً آصف الدولہ نے اپنی والدہ کے نام اس نہر کو موسوم کیا ہوگا۔اب یہ نہر موجود نہیں ہے لیکن ہندوستان والوں کو اہل کربلا اور نجف سے جو دلی عقیدت تھی وہ اس نہر کے ذریعہ ایک سنہری

ورق بن کر تاریخ کے صفحوں کا ایک حصہ بن گئی۔1918 تک عراق خلافت عثمانیہ کے قبضے میں رہا لیکن بیسویں صدی میں انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب یہ ملک حکومت برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا۔حکومت برطانیہ کے خلاف یہاں کے مسلمان مسلسل جدوجہد کرتے رہے جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

1991 میں عراق کے کئی شہروں سمیت نجف میں بھی بغاوت ہوئی اور صدام حسین کی فوجوں کو نجف اشرف سے فرار ہونے پر مجبور ہونا پڑا لیکن بعد میں بعثی فوجوں نے شیعہ باغیوں کو شکست دی تو روضے میں جم کر لوٹ پاٹ کی اور شیعہ علما اور ان کے اہل خاندان کو بڑی تعداد میں شہید کیا۔1991 سے 2003 تک کا زمانہ نجف اور کربلا کے روضوں پر سختیوں کا دور تھا ہر آنے جانے والے کو مشکلات کا سامنا تھا اور ماتم و مجلس کرنے پر پابندی تھی۔صدام حسین کے زوال کے بعد سے دونوں شہروں میں رونق لوٹ آئی ہے اور ہر وقت یہاں مومنین عبادت، ریاضت،اور زیارت میں مشغول نظر آتے ہیں۔سیکورٹی کا انتظام بہت اچھا ہے اور زائرین کی سہولیات کا ہر ممکن خیال رکھا جاتا ہے۔

مسجد کوفہ اور مولا علی کا گھر

نجف میں کچھ گھنٹے رکنے کے بعد ہم لوگ کار کے ذریعہ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔کوفہ اور نجف آج ایک Twin City کی حیثیت رکھتے ہیں۔نجف کہاں پر ختم ہو گیا اور کوفہ کہاں سے شروع ہو گیا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔دکانوں کے بورڈ کے نیچے جب شہر کا نام دکھائی پڑتا ہے تب ہی پتہ چلتا ہے کہ ہم نجف سے کوفے میں پہنچ گئے۔کوفہ عراق کے قدیم شہروں میں سے ایک ہے مسلمانوں کو اس پر اقتدار دوسری خلافت کے زمانے میں ملا جب سعد ابن ابی وقاص نے اس شہر پر 638 عیسوی میں فتح پائی۔خلیفہ دوئم نے سعد کو ہی کوفے کا گورنر بنا دیا۔دو سال کے اندر ہی کوفے کے لوگ سعد کے طور طریقوں اور ناانصافیوں کی شکایتیں لے کر مدینے پہنچنے لگے۔جب یہ شکایتیں بہت بڑھ گئیں تو 642 عیسوی میں سعد کو برخاست کر دیا گیا اور حضرت عمار یاسر کو گورنر بنایا گیا ان کے بعد ابوموسیٰ عشری کو کوفے کا نظم و نسق سونپا گیا وہ بھی کوفے والوں کے میزان پر پورے نہیں اترے تو مغیرہ بن شعبہ کو کوفے کا گورنر بنایا گیا۔تیسرے خلیفہ حضرت عثمان کے زمانے میں ولید ابن عتبہ کو کوفے کا گورنر بنایا گیا۔بعد میں سعد ابن العاس کو کوفے میں تعینات کیا گیا۔حضرت عثمان کے دور میں پوری اسلامی سلطنت میں زبردست چپقلش شروع ہوگئی اور ہر طرف عدم اطمینان کا ماحول پیدا ہو گیا آخر کار مسلمانوں کے ہی ایک گروہ نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا۔اس کے بعد خلافت حضرت علی کے پاس آئی۔انھوں نے کمان سنبھالی تو ان پر بنی ہاشم سے مخاصمت رکھنے والے لوگوں نے ہر طرف سے یلغار کر دی، حضرت علی کو باغیوں اور خلافت کے غداروں سے لڑنے کے لئے مدینے کو چھوڑ کر کوفے کو اپنا دارالخلافہ بنانا پڑا۔یہاں حضرت علی نے چار سال گزارے اور اس زمانے میں ان کو جنگ جمل میں حضرت عائشہ سے، جنگ صفین میں امیر معاویہ سے اور جنگ نہروان میں

خوارج سے ٹکرانا پڑا۔

ان کی شہادت کے چھ مہینے بعد تک امام حسن مسند خلافت پر جلوہ افروز رہے لیکن چھ مہینے بعد امیر معاویہ نے اقتدار پر قبضہ کر کے خلافت راشدہ کا خاتمہ کر دیا اور اس کے بعد ایک شاہی نظام قائم کر دیا۔ معاویہ نے دارالخلافہ کو بھی کوفے سے دمشق میں منتقل کر دیا اور شعیب ابن مغیرہ کو پھر سے یہاں کا گورنر بنا دیا۔

670 میں معاویہ نے اپنے سوتیلے بھائی زیاد ابن ابوسفیان کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ اس شخص کی ماں سمیہ کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا اس لئے زیاد کی ولدیت میں کافی شکوک تھے اور عرب کے لوگ اس کو ابوسفیان کا بیٹا تسلیم نہیں کرتے تھے اس لئے تاریخ کی کتابوں میں اس کو زیاد ابن ابیہ کہا گیا ہے۔ زیاد کا خانوادہ امیر معاویہ اور اس کے بیٹے یزید کا زبردست فرماں بردار اور اطاعت گزار تھا۔

کربلا کے عظیم واقعہ کے وقت عبداللہ ابن زیاد کوفے کا گورنر تھا اور اسی کی دیکھ ریکھ میں مختلف مسجدوں میں منبروں سے حضرت علی پر تبرہ کیا جاتا تھا۔ اسی شخص نے کوفے کے ہر اس شخص کو جیل میں ڈال دیا تھا جس کے دل میں آل رسول کی محبت تھی۔ اسی نے حضرت مسلم بن عقیل کو قتل کروایا۔ اسی کے عہد میں حجر بن عدی اور میثم تمار جیسے جانثاران ہلبیت شہید کے گئے۔ اسی شخص نے کربلا میں امام حسین کو اپنے لشکر سے گھیر کر شہید کروایا اور رسول کی نواسی حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم سمیت مقدس خواتین کو اسیر کروایا اور ان کو کوفے کے گلی کوچوں میں بے مقنہ و چادر گھمایا اور بعد میں ان کو یزید پلید کے دربار میں دمشق روانہ کیا۔

امام حسین کی شہادت کے بعد کوفے سے ہی انقلابات کی ابتدا ہوئی اور قتل امام حسین کا انتقام لینے کے لئے امیر مختار جیسے شیر دل لوگ کھڑے ہو گئے اور انھوں نے قاتلان حسین کو چن چن کر قتل کیا۔ بعد میں اس شہر پر عبداللہ ابن زبیر کی افواج نے قبضہ کیا اور حضرت مختار جیسے

جانثاران حسین کو قتل کیا۔ کوفے پر حجاج جیسے ظالم و جابر کا قبضہ بھی رہا۔

ہشام ابن عبدالملک کے زمانے میں بنی امیہ کے خلاف امام حسین کے پوتے حضرت زید بن علی نے 740 عیسوی میں جہاد کیا اور شہید ہوئے۔ اس وقت کوفے کا گورنر یوسف ابن ثقفی تھا۔

بنی امیہ کے زوال کے بعد کوفے کو 749 عیسوی میں عباسیوں نے اپنا دارالخلافہ بنایا لیکن 762 میں انھوں نے بغداد کو اپنی سلطنت کی راجدھانی بنا لیا۔

شیعوں کے لئے نجف، کربلا، سامرہ اور کاظمیہ کے بعد عراق کا پانچواں اہم ترین شہر کوفہ ہے۔ یہاں کی سب سے اہم زیارت گاہ مسجد کوفہ میں وہ جگہ ہے جہاں حضرت علی کے ضربت لگی تھی۔ مسجد کوفہ کے صحن میں وہ مقام بھی موجود ہے جہاں حضرت علی کی عدالت لگا کرتی تھی اور ان مقامات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جہاں حضرت علی نے مختلف معجزات دکھائے۔ اسی مسجد کے منبر پر بیٹھ کر امام حضرت علی نے کہا تھا کہ ”پوچھ لو پوچھ لو تم کو جو کچھ بھی پوچھنا ہے پوچھ لو اس سے قبل کہ تم مجھ کو کھو دو۔“

کوفہ میں اپنے قیام کے دوران امام زین العابدین اور امام جعفر صادق اسی مسجد میں نماز بھی پڑھا کرتے تھے۔ احادیث میں ملتا ہے کہ اس مسجد میں 12000 پیغمبروں نے عبادت کی ہے اور اسی کے صحن میں حضرت نوح نے اپنی کشتی کی تعمیر شروع کی تھی۔ امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ اس مسجد کے چاروں طرف بارہ میل کا علاقہ نہایت مقدس ہے اور اللہ کی رحمتوں سے سرفراز ہے۔ ہم سب سے پہلے مسجد کوفہ دیکھنے گئے جو اب بہت شاندار بن چکی ہے۔ اس کو موجودہ شکل دینے کا کام بوہرہ فرقہ کے داعی مطلق سیدنا محمد برہان الدین صاحب نے شروع کیا تھا جو 2010 میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔

اس کے وسیع و عریض صحن میں ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ خاص طور پر اس محراب تک

پہنچنے کے لئے ہروقت قطاردرقطار لوگ کھڑے رہتے ہیں جہاں مولا علی کا مقدس خون بہا تھا۔
مسجد کوفہ سے کچھ ہی قدم کے فاصلے پر حضرت علی کا گھر اور ان کا کھودا ہوا کنواں موجود ہے۔
مسجد سے ہی ملحق حضرت مسلم بن عقیل، حضرت امیر مختار، ہانی ابن عروہ کی قبور ہیں مسجد سے باہر نکلتے ہی امام حسین کی ایک بہن حضرت خدیجہ بنت علی کا ایک چھوٹا سا روضہ بنا ہوا ہے۔
ہم نے اس محراب کی زیارت کے بعد تمام قبور پر حاضری دی لیکن مجھ کو سب سے زیادہ رونا حضرت امیر مختار کی قبر پر آیا شائد اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں بھی عام شیعوں کی طرح حضرت مختار سے بہت محبت کرتا ہوں۔ وہی تو تھے جنھوں نے قاتلان حسین کو واصل جہنم کیا اور جب انھوں نے حرملہ کا سر امام زین العابدین کی خدمت میں بھیجا تو کربلا کے واقعہ کے بعد امام پہلے پہل مسکرائے تھے۔ یہی سب باتیں مجھے ان کی قبر پر جا کر یاد آتی رہیں اور میں حسین کے اس شیر کی جانثاری اور جذبۂ ایمانی کو آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا رہا۔
مغرب اور عشا کی نماز اور زیارت کی خصوصی نمازیں پڑھنے کے بعد ہم سب مسجد سے باہر نکلے اور حضرت خدیجہ بنت علی کی قبر پر گئے۔ اس کے پاس ہی ایک محفل ہو رہی تھی جس میں عربی میں نعت ومنقبت پڑھنے والے لوگ موجود تھے۔ یہاں ہم کو تبرک میں ایک کولڈ ڈرنک اور کیک پیش کیا گیا۔
مسجد کے آس پاس جگہ جگہ پر چائے اور شربت کی سبیلیں لگی تھیں۔ جن پر مقتدیٰ صدر اور شہید باقر الصدر کی تصاویر لگی تھیں۔ پورے کوفے میں ہر چوراہے پر مقتدیٰ صدر کی تصاویر اور ان کی پارٹی مہدی ملیشیا کے متعلق نعروں والے بینر اور ہورڈنگ بڑی تعداد میں نظر آرہے تھے۔ جس سے محسوس ہوتا تھا کہ کوفہ مقتدیٰ صدر کا ایک بڑا گڑھ ہے۔
مسجد کے بعد ہم لوگ حضرت علی کا گھر دیکھنے گئے۔ اس گھر کی سادگی دیکھنے کے قابل ہے۔ ہم جیسے لوگ جو اونچے اونچے مکانوں اور عالیشان گھروں کی جستجو میں اپنی زندگی کو اجیرن کر لیتے

ہیں اس گھر کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ امام جو دونوں جہاں کا مالک تھا کس قدر سادگی سے زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ جس امام کے قبضے میں عراق، ایران، عرب اور شام جیسے ممالک ہوں اس کا گھر اس قدر سادہ تھا یہ دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔
گو کہ چودہ صدیاں بیت جانے اور عقیدت مندوں کی جانب سے اس پر بے شمار چڑھاوے چڑھائے جانے کی وجہ سے یہ گھر اپنی اصلی حالت میں نہیں ہے لیکن جو نشانات ہیں ان ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ گھر کس طرح کا رہا ہوگا۔ حضرت زینب کہاں رہتی ہوں گی؟ حضرت حسن اور حسین کس جگہ نماز پڑھتے ہوں گے؟ حضرت عباس اور ان کے بھائی کہاں اٹھتے بیٹھتے ہوں گے؟ اس گھر کے چھوٹے چھوٹے سے کمرے ساری روداد خود بیان کرتے ہیں۔ عراق میں یہ پہلی جگہ ایسی تھی جہاں نذور اور عطیات کی رقم مانگنے کے لئے ایک صاحب موجود تھے جو یہاں کے سادات کا خاص لباس پہنے تھے ورنہ ابھی تک کسی روضے میں کہیں بھی کوئی فرد واحد پیسے مانگتا ہوا نظر نہیں آیا تھا۔ یہی ایک بچہ بھی ملا جو سب کو بتا رہا تھا کہ یہاں حضرت زینب نماز پڑھتی تھیں یہ کمرہ امام حسن حسین کا تھا لیکن آخر میں سب سے ہندی میں کہتا پیسے یہاں رکھو۔ غالباً اس کو کسی نے یہ جملہ سکھا دیا تھا تاکہ وہ ہندوستانی اور پاکستانی زائرین سے پیسے آسانی سے طلب کر سکے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس طرح کی خرد برد عراق کے زیادہ تر روضوں پر نہیں ہے۔ زائرین کی جانب سے براہ راست ضریح میں پیسے ڈال دئے جاتے ہیں اور چڑھاوے کے کروڑوں روپئے کی اس رقم کا استعمال براہ راست مرجع تقلید کی دیکھ ریکھ میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے عراق کے سب ہی روضوں کی دیکھ بھال بہت شاندار طریقے سے ہو رہی ہے۔
حضرت علی کے گھر کے باہر جو کنواں ہے وہاں کا پانی مومنین اپنے ساتھ لے جانے کی بڑی تمنا رکھتے ہیں۔ اسی لئے وہاں پلاسٹک کی کین بیچنے والے لڑکے بھی موجود تھے جن سے بوتلیں اور کین خرید کر لوگ پانی بھر کر اپنے گھر لئے جا رہے تھے۔ ہم سب نے بھی اسی پانی سے وضو کیا

اور سیراب ہونے کی سعادت بھی حاصل کی۔ یہاں کے بعد ہم کو حضرت میثم تمار کے مزار پر جانا تھا لیکن سب لوگ بہت تھک گئے تھے اور اس کو کل پر موقوف کر دیا گیا۔ رات کو ہم لوگ نجف میں واپس لوٹ آئے۔ وہیں رات کا کھانا کھایا۔ پروفیسر عین الحسن کو صبح واپس ہندوستان جانا تھا اور ان کو تبرکات کی خریداری بھی کرنا تھی لیکن نجف میں دکانیں شام کو بہت جلدی بند ہو جاتی ہیں اس لئے وہ بہت کوشش کے باوجود کچھ خرید نہیں سکے۔

دوسرے دن صبح پانچ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ میرے سینے میں شدید درد تھا۔ میں سمجھا کہ شائد ہارٹ اٹیک ہے۔ پہلے سوچا کہ کسی کو جگا کے بتاؤں لیکن دوسرے ہی لمحے میں خیال آیا کہ اگر یہ لوگ اسپتال لے گئے اور وہاں میں مر گیا تو پھر مولا کے روضے کی زیارت دوبارہ نہیں کر سکوں گا۔ یہ خیال آتے ہیں میں چپکے سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل کے مولا علی کے روضے میں پہنچ گیا جو مشکل سے پانچ سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر مرنا ہے تو اس در پہ مروں جہاں دم توڑنے کی خواہش ہر شیعہ کو ہوتی ہے۔

میں روضے کے اندر پہنچا۔ اپنا پاسپورٹ بھی میں نے جیب میں رکھ لیا تھا تا کہ مرجانے کے بعد لاش کی شناخت کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔ روضے میں داخل ہو کر میں سیدھا ضریح پر گیا۔ وہاں بوسہ دیا اور پھر صحن میں آ کر اس کمرے کے قریب میں لیٹ گیا جہاں آیت اللہ العظمیٰ سید الخوئی کی قبر ہے۔ عجیب بات تھی کہ نہ تو مجھے موت کا خوف تھا نہ ہی مجھے ڈاکٹر یا طبیب کی ضرورت تھی ہر طرف سکون کی لہریں موجزن تھیں۔ تھوڑی دیر بعد میرے سینے کا درد کم ہونے لگا۔ جب تھوڑا افاقہ ہوا تو میں نے وضو کیا اور نماز ادا کی۔ نماز ادا کر کے پھر لیٹ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اور واپس کمرے میں آ گیا۔ زندگی میں شائد پہلی بار میں مرنے کے لئے پوری طرح آمادہ تھا۔ مجھے اپنی ہمت پر خود بہت حیرت تھی ورنہ موت سے اب تک میں اسی طرح ڈرتا آیا تھا جیسے کہ عام لوگ ڈرتے ہیں مگر آج مجھے وطن سے ہزاروں میل دور غریب

الوطنی کی موت پر زبردست اطمینان تھا۔ اس سے بہتر موت کا تصور کون کر سکتا ہے بھلا؟

میں کمرے میں آ کر پھر سے سو گیا اور جب بیدار ہوا تو عین الحسن جا چکے تھے۔ مجھے مولانا علی عباس نے بتایا کہ وہ تبرکات خریدنے میں کامیاب رہے کیوں کہ نجف میں دکانیں بہت سویرے کھل جاتی ہیں۔

دس بجے کے قریب ہم لوگ شیعوں کے ایک اور مرجع تقلید آیت اللہ العظمیٰ سید بشیر نجفی سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے ان کا گھر بھی حضرت علی کے روضے سے کچھ ہی دور پر واقع ہے۔ یہاں بھی سادگی اور ایک عالم دین کی جیسی شان نظر آ رہی تھی۔ یہاں سیکورٹی اس قدر سخت نہیں تھی جتنی کی آیت اللہ سیستانی کے گھر پر تھی۔ بشیر نجفی صاحب لدھیانہ کے رہنے والے ہیں لیکن تقسیم وطن کے بعد ان کی فیملی پاکستان چلی گئی تھی جہاں سے وہ کچھ ہی عرصہ کے بعد نجف اشرف چلے گئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کی۔ گزشتہ ساٹھ برس سے وہ عراق میں ہی مقیم ہیں۔ ان کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ ان کو عربی پر اس قدر عبور حاصل ہے کہ عراق کے وہ لوگ جن کی مادری زبان عربی ہے ان سے اکثر مشکل عربی الفاظ کے معنی پوچھنے کے لئے آیا کرتے ہیں۔ آیت اللہ العظمیٰ بشیر نجفی بھی ہم لوگوں کے ساتھ بہت محبت اور اخلاق سے پیش آئے۔ انھوں نے کئی بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ہندوستان آنا چاہتے ہیں لیکن بار بار یہ بھی کہتے رہے کہ وہاں جانے کے اخراجات اس قدر ہوں گے کہ جن کو برداشت کرنا مشکل ہو گا۔ چلتے وقت انھوں نے ہم لوگوں کو ایک ایک در نجف تحفہ میں دیا۔

گیارہ بجے کے قریب ہم لوگوں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور اپنا سامان لے کر کوفے کی طرف کار کے ذریعہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں میں نے مولانا علی عباس سے پوچھا کہ یہاں نواب آصف الدولہ نے جو نہر بنوائی تھی اس کا کچھ اتا پتہ ہے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں ایسی کوئی نہر یہاں موجود نہیں لیکن نجف کے پرانے لوگ ایک نہر کا ذکر کرتے ہیں جس کو نہر بہو بیگم کہا جاتا تھا۔ میں سمجھ

گیا کہ یہ وہی نہر ہو گی جس کو نواب آصف الدولہ نے اپنی والدہ کے نام منسوب کر دیا ہو گا۔
تھوڑی دیر میں ہم لوگ پھر کوفے میں پہنچ گئے اور یہاں مسجد صہلا کی زیارت کی۔ یہ مسجد ڈیزائن کے لحاظ سے کچھ مختلف ہے۔ مسجد میں ایک وسیع وعریض صحن ہے جس کے چاروں طرف محرابیں بنی ہیں اور صحن کے درمیان بھی ایک محراب واقع۔ کہا جاتا ہے ہ یہاں پیغمبر حضرت ادریس کا گھر بھی تھا اور وہ یہیں نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایسی روایات موجود ہیں کہ اس مسجد میں مختلف انبیا، آئمہ اور اولیا نے نماز ادا کی ہے۔ اسی لئے یہاں حضرت ادریس، حضرت ہود، حضرت خضر، حضرت ابراہیم کے نام سے منسوب خاص محرابیں ہیں۔ ان کے علاوہ امام زین العابدین، امام جعفر صادق اور امام زمانہ سے بھی ان محرابوں کو منسوب کر دیا گیا ہے جہاں ان اماموں نے نماز ادا کی تھی۔ اس مسجد کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام زمانہ جب ظہور کریں گے تو یہیں اپنی عدالت قائم کریں گے۔

مسجد صہلا میں خصوصی نمازیں ادا کرنے کے بعد ہم لوگ واپس نجف کی طرف چلے راستے میں حضرت میثم تمار کی قبر کی باہر سے ہی زیارت کی۔ شائد میری قسمت میں نہیں تھا کہ علی کے اس چاہنے والے کی قبر پر جا سکوں جو دنیا میں اظہار رائے کی آزادی کے لئے جان دینے والوں میں سر فہرست ہیں۔ حضرت میثم تمار کو مصلوب کیا گیا لیکن ان کی زبان کو مدحت آل رسول سے کوئی روک نہیں سکا۔ میں نے علی کے اس جانثار کو دور سے ہی سلام عرض کیا۔ اور نجف کی طرف ہماری گاڑی چل پڑی

پھر کربلا میں

ہم لوگ نجف کے اندر سے ہوتے ہوئے پھر کربلا کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے بھر ہزاروں کی تعداد میں مومنین و مومنات اپنے بچوں کے ساتھ کربلا کی طرف رواں دواں تھے۔ یہ لوگ پندرہ شعبان کو امام مہدی کے یوم ولادت کا جشن منانے کے لئے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں عراق میں ایک عام رسم یہ ہے کہ سال میں تین موقعوں پر لوگ اپنے اپنے شہر اور گاؤں سے پا پیادہ کربلا کی طرف نکلتے ہیں۔ سب سے بڑی تعداد میں چہلم کے موقع پر لوگ کربلا جاتے ہیں۔ دوسرا موقع پندرہ شعبان کا ہوتا ہے جب اپنے آقا حسین کی بارگاہ میں ان کے وارث کا جشن منانے کے لئے یکجا ہوتے ہیں اور تیسرا اہم موقع عرفہ یعنی یوم عرفات ہوتا ہے۔ اسی دن امام حسین نے اپنے حج کو عمرہ سے بدل کر عراق کا رخ کیا تھا اس دن بھی لاکھوں عراق کربلا کی طرف پا پیادہ روانہ ہوتے ہیں۔

راستے بھر ان محبان حسین کے لئے کھانے پینے ٹھیرنے اور نماز ادا کرنے کے بھرپور انتظامات کئے جاتے ہیں۔ نجف سے کربلا تک ہر طرف انجمنوں کے کیمپ لگے تھے جن کو موکب کہا جاتا ہے۔ ہر جگہ کھانا، پانی چائے اور ناشتہ کا بہت اچھا انتظام تھا۔ ہم لوگوں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا اور میری دلی خواہش تھی کہ میں بھی مومنین کے ساتھ بیٹھ کر کسی موکب میں کھانا کھاؤں۔ ہم لوگوں نے اپنے ڈرائیور سے کہا کہ کسی موکب میں ہم سب کو کھانے کے لئے لے چلے۔ وہ غور سے دیکھتا رہا اور کہنے لگا کہ چوں کہ ہم سب کو بہت دیر ہو چکی ہے اس لئے لنچ کا ٹائم ختم ہو گیا ہے اور اب زیادہ تر موکبوں میں صرف چائے مل رہی ہے۔ کافی دور چلنے کے بعد ایک جگہ پر اس نے گاڑی روک دی۔ وہاں پر سڑک پر خیمے لگے تھے جہاں عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ خیمے تھے۔ یہاں کے منتظمین نے بہت ہی تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا اور جب ان

کو ہمارے ڈرائیور نے یہ بتایا کہ ہم لوگ ہندوستان سے آئے ہیں تو ہمارے میزبان اس قدر خوش ہوئے کہ انتہا نہیں۔ ہم سب کو فرش پر بٹھایا گیا۔ یہاں لنچ ابھی تک مل رہا تھا۔ کچھ دیر میں ہمارے لئے مونگ کی دال کے بنے ہوئے گرما گرم بڑے، ٹماٹر کی سلاد اور گرما گرم روٹی آ گئی۔ (مجھے یہ کھانا دیکھ کر ممبئی کا 'بڑا پاؤ' یاد آیا عراق میں بھی عام طور لوگ اسی طرح روٹی کے درمیان مونگ کے بڑے رکھ کر کھاتے ہیں) ہم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ خوب ٹھنڈا پانی پیا اور بغیر دودھ کی عراقی چائے کا مزہ لیا۔ وہاں رکھے حقے کے دو چار کش بھی لگائے۔

اس طرح نجف اور کوفے کا سفر ختم ہوا اور ہم پھر حضرت عباس اور حضرت امام حسین کے شہر میں پہنچ گئے۔ نجف سے کربلا میں داخل ہوتے ہی حضرت عباس کا روضہ دکھائی پڑتا ہے۔ ہمارے ڈرائیور نے روضہ دیکھتے ہی کہا السلام علیک یا ابوالفضل العباس اور ہم سب نے بھی اپنے مولا کو سلام عرض کیا۔

کربلا پہنچ کر ہم اپنے نئے ہوٹل باب الجنہ میں آئے۔ اس ہوٹل کی خوبی یہ تھی کہ یہ امام حسین کے روضے کے بالکل قریب تھا۔ باب القبلہ کے عین سامنے واقع اس ہوٹل اور روضے کے درمیان صرف ایک سڑک واقع تھی۔ اب مہمان داری ختم ہو چکی تھی اب ہم کو ایک عام زائر کی طرح یہاں رہنا تھا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں پانچ آدمی تھے اور کرایہ 100 ڈالر یعنی فی کس 20 ڈالر۔ عام دنوں میں اس ہوٹل میں کمروں کا کرایہ 30 یا 35 ڈالر ہوتا ہے لیکن مخصوص دنوں میں ان کا کرایہ آسمان پر پہنچ جاتا ہے اور ہوٹلوں میں جگہ ملنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔ پندرہ شعبان کے جشن میں شریک ہونے والوں کی آمد کی وجہ سے اب کربلا میں راستہ ملنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر سڑک ہر فٹ پاتھ پر لوگ ہی لوگ تھے۔ روضے کی منتظمہ کمیٹی جانب سے آس پاس کی تمام علاقوں کی سڑکوں کے کنارے قالین بچھا دئے تھے جن پر عراقی زائرین کے خانوادے قیام پذیر تھے۔ غیر ممالک سے آنے والے زائرین کے قافلوں کے

لئے یہاں کے ویزہ کی شرائط میں لازمی ہے کہ وہ ہوٹل میں قیام کریں گے اس لئے ہوٹل تلاش کرنے والے لوگ مسلسل ہمارے ہوٹل میں آ رہے تھے اور معلوم کر رہے تھے کہ کوئی کمرہ خالی ہے یا نہیں۔ بھیڑ اس قدر زیادہ تھی کہ آج پہلی بار مجھے مغرب کی نماز ادا کرنے کے لئے امام حسین کے روضے میں جگہ نہیں ملی اور مجھ کو زینبی ٹیلے کے سامنے والی سڑک پر نماز ادا کرنا پڑی۔

رات کو آغا سلطان کے ایک دوست محمد فلاح نے اپنے گھر پر شاندار دعوت کی۔ ان کا گھر امام کے روضے سے تقریباً ایک کلومیٹر دور کربلا کے مقامی بس اسٹینڈ کے ایک دم پیچھے واقع ہے۔ بہت ہی کشادہ گھر ہے طرح طرح کے پیڑ لگے ہیں۔ بہت خوبصورت گارڈن ہے۔ انگور کی بیلوں پر سرخ اور سبز انگوروں کے گچھے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ فلاح سے میں نے جب پوچھا کہ کھجوریں توڑی کیسی جاتی ہیں تو اس نے فوراً ہی رسی کا ایک گھیرا اٹھایا اور اس کو اپنی کمر اور کھجور کے پیڑ کے درمیان پھنسایا اور پھر پلک جھپکتے میں اسی رسی کے ذریعہ کھجور کے پیڑ کے آخری سرے پر پہنچ گیا اور اپنے ہاتھ سے توڑ توڑ کر کھجوروں کو کمر میں بندھی تھیلی میں بھرنے لگا۔ یہ کام بہت خطرناک ہے لیکن عراقی عوام کے لئے یہ ایک پسندیدہ عمل ہے۔ کھانا کھانے کے بعد میں خیمہ گاہ (جس کا ذکر آگے کے صفحات پر ہے) اور حضرت عباس کے روضے پر چلا گیا اور رات ساڑھے بارہ بجے تک وہیں رہا۔

13 شعبان کی صبح کو آنکھ کھلی اور ہوٹل کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ تھی۔ اس قدر ہجوم تھا کہ لوگ رینگ رہے تھے۔ اسی درمیان ایک عراقی نوجوان میرے کمرے میں آیا۔ وہ فراٹے سے انگریزی، عربی اور فارسی بولتا تھا۔ اس نے مجھے سیمینار میں دیکھا تھا اس لئے مجھ سے واقف تھا۔ میں نے اس کو اپنے ہوٹل کا پتہ دے دیا تھا اور بتایا تھا کہ ہم لوگ ہوٹل بدلنے والے ہیں اس کے بعد وہ نوجوان ایک آدھ بار میرے پاس آیا بھی تو میں

ہوٹل میں نہیں تھا اس لئے ملاقات نہیں ہوسکی۔آج وہ مجھ سے ملنے کے لئے پہلے الرایات ہوٹل گیا اور پھر وہاں سے اس ہوٹل کا پتہ لے کر مجھ سے ملنے یہاں آیا تھا۔اس نو جوان کا نام محمد معاش تھا۔اس نے مجھے بتایا کہ وہ امریکہ میں قیام پذیر ہے اور میڈیا کا طالب علم ہے۔اس نے بتایا کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر وہ انوار الحسین نام کا ایک چینل کھولنا چاہتا ہے۔اس کی پروجیکٹ رپورٹ بھی اس نے مجھے دی اور ہم نے چینل کے متعلق مختلف امور پر بات چیت کی۔محمد معاش نے مجھے تحفے میں ایک بہت بڑا درنجف اور ایک پتھر کا چھوٹا سا ٹکڑا دیا جس کے بارے میں یہ بتایا کہ یہ امام حسین کی قبر کا پتھر ہے۔جب قبر پر دوسرا پتھر چڑھایا گیا تو پرانے پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مومنین میں تقسیم کر دئے گئے۔یہ پتھر اسی تبرک کا ایک حصہ تھا۔میں اس شاندار تبرک پر بہت مسرور تھا مجھ کو لگ رہا تھا کہ امام زمانہ نے میری دعا سن لی اور ایک مومن کے ہاتھ مجھے ایسا نادر و نایاب تحفہ بھجوایا کہ جس کو میں اپنے ساتھ قبر میں بھی لے جا سکتا ہوں۔مجھے بہت افسوس ہے کہ محمد معاش سے میری دوبارہ ملاقات نہیں ہوسکی نہ تو فون سے اس سے بات ہوسکی اور نہ ہی مجھے اس کا پتہ معلوم تھا کہ میں مل کر اس کو دوبارہ شکریہ ادا کرتا۔میں بھی اس نو جوان کو تحفے میں ایک قلم دینا چاہتا تھا لیکن ملاقات نہ ہوسکی۔

آج میں نے ان مقامات کی زیارت کی جہاں حضرت عباس کے ہاتھ کٹے تھے۔اپنے جرار آقا کے دست مبارک قطع ہونے کی جگہ پر اشک افشانی کی اور سارا دن کربلا کی گلیوں میں گھوم کر گزارا۔شام کو امام حسین کے روضے پر مغرب کی نماز پڑھی۔یہاں میں نماز شروع ہونے سے ایک گھنٹہ قبل ہی پہنچ گیا تھا اس لئے جگہ مل گئی۔نماز کے بعد کھانا امام حسین کے روضے پر ہی کھایا کیوں کہ منتظمہ کمیٹی کے لوگوں نے آغا سلطان کو کھانے کے کچھ کوپن دوپہر میں ہی دے دئے تھے۔ڈنر کے بعد ہم سب حضرت عباس کے روضے پر گئے اور کافی دیر تک وہیں رہے۔

جشن امام مہدیؑ

آج کربلا کی رونق دیکھنے ہی والی تھی ہر طرف سے لوگ جوق در جوق چلے آرہے تھے۔انسانوں کا سمندر ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔عراق کے مختلف علاقوں سے آنے والے باشندے اپنے روایتی کپڑوں میں ملبوس یہاں پہنچ رہے تھے۔یہ لوگ جھوم جھوم کر عربی میں مدحت کے گیت گا رہے تھے اور تالیوں کے ذریعہ ایک قسم کی موسیقی پیدا کر رہے تھے۔کچھ لوگ منہ سے بھی طرح طرح کی مسرت آمیز آوازیں نکال رہے تھے۔ہندوستان میں مذہبی تقریبات میں اس قسم کا ماحول نہیں ہوتا ہے۔وہاں کی مذہبی محافل میں تالیاں بجانا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے ہم ہندوستانیوں کو اس قسم کے جشن میں مزہ نہیں آرہا تھا حالانکہ میں سوچ رہا تھا کہ شرع میں تالیاں بجانے کی تو کوئی ممانعت نہیں ہے تو پھر ہم لوگ اس عراقی طریقے سے خوش کیوں نہیں ہو رہے ہیں۔ایرانی زائرین بھی اس قسم کے جشن سے الگ تھے۔ایرانیوں کے قافلے بھی آرہے تھے لیکن وہ لوگ منقبتی اشعار پڑھ رہے تھے اور بیشتر زائرین کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔

ابھی ہم لوگ ہوٹل کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ ہی رہے تھے کہ ہندوستان کے مشہور شاعر جناب رضا سرسوی صاحب ہمارے ہوٹل میں آگئے۔ان کے آنے کے بعد سب نے فرمائش کی کہ آج امام زمانہ کی مدح میں ہوٹل کے کمرے میں ہی محفل ہوجائے۔میں نے اور رضا بھائی نے امام کی بارگاہ میں اشعار پیش کئے اور ثواب میں شامل ہوئے۔رضا بھائی کافی دیر ہمارے ساتھ رہے۔

دن میں شدید گرمی کی وجہ سے ہوٹل سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔شام کو ہم سب ایک ساتھ باہر نکلے۔سڑک پر پیر رکھنے کی جگہ نہیں تھی فٹ پاتھ پر بچے اور خواتین بیٹھے ہوئے

تھے، سڑک پر جلوس ہی جلوس چل رہے تھے۔ کچھ خواتین نے سڑک کے کنارے شمعیں جلا رکھی تھیں۔ مجھ کو ہندوستان کی شب برات یاد آئی جہاں آج کی رات کروڑوں روپئے کی شمعیں اور اگر بتیاں قبرستانوں میں جلائی جاتی ہیں مگر یہاں شمعیں تو کہیں کہیں دکھائی بھی پڑ رہی تھیں لیکن اگر بتی کا دور دور کہیں پتہ نہیں تھا۔ اصل میں کبھی کبھی کلچر اور ثقافت ہم پر اس قدر غالب ہو جاتے ہیں کہ ہم ان ہی کو اپنا مذہب سمجھنے لگتے ہیں۔

ہم اسی بھیڑ کا ایک حصہ بن گئے اور پھر کسی کو خبر نہیں رہی کہ کون کہاں ہے۔ روضے کے اندر داخل ہونے والا ہجوم ایک ہی نعرہ لگا رہا تھا لبیک یا حسینؑ۔۔۔ لبیک یا حسینؑ۔ ایسا لگتا تھا کہ امام کی صدائے استغاثہ سن کر ان کے جاں نثار لبیک لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوں۔ میں بھی چیخ چیخ کر ان ہی صداؤں میں اپنی آواز ملا رہا تھا۔ آج مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور اب نوجوانوں کی اس بھیڑ میں شامل ہو کر چلنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ضریح تک پہنچنے کے دوران کئی بار ایسا لگا کہ دم نکل جائے گا لیکن اس ہجوم میں واپس جانے کا تصور بھی محال تھا اس لئے بس میں نے خود کو ہجوم کے سہارے پر ہی چھوڑ دیا۔ اسی ہجوم نے مجھے ضریح امام حسینؑ تک پہنچ دیا اور اسی ہجوم نے مجھے اپنے نرغے میں لے کر باہر پہنچا دیا۔

بھیڑ سے نکلنے کے بعد میں کافی دیر بعد نارمل ہو سکا پھر میں نے ایک کونے میں نماز ادا کی اور روضۂ امام حسینؑ سے باہر نکل کر آیا اور سوچا کہ دونوں حرموں کے چاروں طرف جو سڑک ہے اس کا ایک چکر لگایا جائے۔ میں عراقی لوگوں کے ایک جلوس میں ہی شامل ہو کر چلنے لگا کیوں کہ سڑک پر اکیلے چلنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس وقت تک رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اچانک ایک دھماکے کی آواز آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کہیں قریب میں ہی بم پھٹا ہے۔ سڑک پر موجود عوام میں ایک ہلکا سا ہیجان پیدا ہوا میں بھی محتاط ہو گیا اور ایک ٹینکر کے پاس کھڑا ہو گیا کیوں کہ مجھے لگا کہ دھماکے کے بعد خدانخواستہ بھگدڑ نہ مچ جائے لیکن کچھ ہی سکنڈوں کے اندر حضرتت عباس

کے روضے پر لگے لاؤڈ اسپیکر سے عربی میں کچھ اعلان ہوا اور پھر سب نارمل ہو گیا۔ پھر سے امام کے دیوانے امام کے جشن میں محو ہو گئے۔ میں پریشان رہا کہ بم دھما کہ کہاں ہوا ہے کتنے لوگ اس میں شہید ہوئے اس کی خبر مل جائے لیکن کچھ معلوم نہیں ہوا۔ میں آگے بڑھا تو حضرت عباس کے روضے کے باب موسیٰ کاظم کے سامنے لاہور کے میرے دوست جناب عقیل خلیفہ سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے بارے میں رضا سرسوی صاحب نے بتایا تھا کہ وہ اپنے خانوادے کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ اسی موڑ پر دہلی کے ایک شاعر باقر چھندیڑوی مل گئے ۔ ان لوگوں سے مل کر آگے بڑھا تو دیکھا کہ خون کا عطیہ دینے والوں کے لئے ایک کیمپ لگایا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ چلو ایک بوتل خون ہی دے دوں لیکن بلڈ بینک کے لوگوں نے معذرت کا اظہار کر دیا اور کہا کہ ان کے پاس blood kits ختم ہو گئے ہیں۔

دیر رات تک میں گھومتا رہا کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ کھانے کی بھی آج دشواری تھی اس لئے آج کی رات سینڈوچ کھا کر گزاری۔ کربلا میں رات بھر جشن چلتا رہا لیکن مجھ پر تھکن غالب تھی اس لئے میں ایک ڈیڑھ بجے رات کو ہوٹل میں واپس آ کر سو گیا۔

خیمہ گاہ کی زیارت

پندرہ شعبان کی صبح کی نماز کے لئے آغا سلطان نے مجھے بہت جگایا لیکن میں حرم کے اندر نماز کے لئے نہیں جا سکا مجھے معلوم تھا کہ وہاں جگہ نہیں ملے گی اس لئے میں نے کمرے پر ہی نماز پڑھی اور سو گیا۔ گیارہ بجے تک سوتا رہا۔ آج ہم لوگوں کو آغا سلطان کے ایک دوست مسٹر دجا نے لنچ پر بلایا ہے۔ دجا صاحب مخیم کے سربراہ ہیں۔ مخیم یہاں اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں امام حسین نے اپنے خیمے نصب کئے تھے۔ ہندوستانی زائرین اس کو خیمہ گاہ کہتے ہیں۔ یہ جگہہ زینبی ٹیلے کے ٹھیک پیچھے واقع ہے اور امام حسین کی قتل گاہ سے اس کا فاصلہ محض 300 میٹر ہے لیکن اس کے سامنے اب دکانیں وغیرہ بن جانے کی وجہ سے ذرا گھوم کر جانا پڑتا ہے اس لئے یہ راستہ آدھے کلومیٹر سے کچھ زیادہ کا ہو گیا ہے۔

ہم لوگ جب خیمہ گاہ میں پہنچے تو یہاں ہم کو مہمانوں کی طرح ہی Treat کیا گیا اور اس کمرے میں لے جا کر بٹھایا گیا جس کو تشریفات کہا جاتا ہے۔ (عراق کے ہر روضے میں ایک کمرہ ایسا ہوتا ہے جس کو تشریفات یعنی وی آئی پی حضرات کو بٹھانے کی جگہ کہا جاتا ہے) دجا صاحب نے ہم لوگوں کو کھانا کھلایا اور ہم سب نے لنچ کے بعد ان ہی کے کمرے میں نماز پڑھی۔ انھوں نے اپنے فوٹو گرافر کو ہم لوگوں کے ساتھ خیمہ گاہ میں بھیجا۔ تا کہ ہم لوگ زیارت کے ساتھ ساتھ وہاں تصویریں بھی کھنچوا سکیں۔

خیمہ گاہ میں منتظمین نے ان تمام جگھوں کی نشان دہی کی ہے جس کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ امام حسین کے خیمے نہر فرات کے کنارے سے ہٹا کر کہاں پر لگائے گئے تھے۔ آپ جیسے ہی خیمہ گاہ داخل ہوں گے تو سب سے پہلے اس شیر کا خیمہ ملے گا جس نے لشکر شام کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ یعنی سب سے آگے حضرت عباس کا خیمہ لگا تھا۔ پھر دوسرے اصحاب اور

اعزا کے خیموں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ حضرت زینب و ام کلثوم کا خیمہ امام حسین کے خیمے کی پشت پر تھا۔ اس خیمے کے سامنے ہی امام زین العابدین کا خیمہ تھا۔ یہ سب خیمے ایک ہی ہال کے اندر موجود ہیں لیکن اس ہال سے باہر نکلنے کے بعد حضرت قاسم کا خیمہ دکھائی دیتا ہے شائد کرب و بلا کے دولھا کے لئے امام نے ایک خصوصی خیمے کا اہتمام بھی الگ سے کیا تھا۔

زیارت کے بعد ہم لوگ پھر مسٹر دجا کے کمرے میں آئے تو انھوں نے ہم لوگوں کو ایک یادگار تحفہ دیا۔ انھوں نے ہم سب کو کچھ کھجوریں دیں ظاہر ہے کھجور عراق میں کوئی ایسا تحفہ نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے لیکن یہ کھجوریں ایسی خاص تھیں کہ کربلا کے سفر کے دوران ملنے والی سب سے یادگار سوغات بن گئیں۔ مسٹر دجا نے بتایا کہ یہ کھجوریں ان پیڑوں کی ہیں جو امام حسین اور حضرت عباس کے روضے کے درمیان لگے ہیں۔ مسٹر دجا نے بتایا کہ ان کو تمر شفا بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کھجوروں کو کھانے کے بعد کئی ایسے لوگ شفایاب ہوئے جن کو کسی دوا سے افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ گو کہ ہم سب کے حصہ میں صرف پندرہ بیس کھجوریں ہی آئیں لیکن ان کو حاصل کر کے مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی بہت بڑی دولت مل گئی۔ خیمہ گاہ سے واپسی میں ایک دکاندار نے خاک شفا کی سجدہ گاہ کا ایک ایک پیکٹ مفت میں ہم سب کو دیا۔ اس نے ایسا کیوں کیا ہم کو نہیں معلوم کیوں کہ اس وقت تو سجدہ گاہ فروخت ہونے کا زبردست سیزن چل رہا تھا۔

کربلا میں آخری رات

کمرے پر لوٹ کر شام تک آرام کیا اور پھر مغرب کی نماز حضرت عباس کے روضے پر ہی ادا کی اور شام کا کھانا بھی حضرت عباس کے دستر خوان پر کھانے کا شرف ملا۔ آج بھی روضے پر بہت بھیڑ تھی میں پھر ایک بار اسی بھیڑ میں گم ہو گیا اور سب کو ڈھونڈتا رہا۔ جب کوئی نہیں ملا تو روضے سے باہر نکل کر آیا اور یہاں کا میڈیکل سینٹر دیکھنے گیا۔ جہاں حضرت عباس کے روضے کے چیف انجینئر مسٹر طلال کا بیٹا ابراہیم ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے ساتھ بیمار زائرین کو مفت میں دوائیں تقسیم کرنے میں مصروف تھا۔ ابراہیم نے وہاں کے ڈاکٹروں سے ملاقات کروائی اور دکھایا کہ کس طرح ایمرجنسی کے کیسوں کو وہاں سنبھالا جاتا ہے اور کسی مریض کی حالت بگڑ جانے کی صورت میں اس کو اسپتال میں منتقل کرنے کا کیا انتظام ہے۔ میڈیکل سینٹر دیکھ کر میں فرات کی جانب چل پڑا۔

فرات کے آس پاس سناٹا تھا میں اسی پل پر جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے پہلے دن میں نے فرات سے گفتگو کی تھی آج پھر رات کی اس تنہائی میں دیر تک میں فرات کی لہروں سے سوال کرتا رہا اور اس کی خاموشی مجھے جواب دیتی رہی۔ مجھے لگا کہ جیسے فرات کہہ رہی ہو کہ میں نے پہلی بار جب قمر بنی ہاشم کا چہرہ دیکھا تو میں فرط مسرت سے جھومنے لگی گو کہ مجھے معلوم تھا کہ مجھے حشر تک آنسو ہی بہانا ہیں پھر بھی میں اہلبیت رسول کی زیارت کر کے اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی، فرات مجھ سے شائد کہہ رہی تھی کہ کربلا آنے کے بعد حسین کے اصحاب اور اقربا میرے نزدیک آتے رہے اور قافلے والوں نے دو محرم سے لے کر سات محرم تک پانچ دن میرے پانی سے اپنا گلا تر کیا اور مجھے یہ شرف بخشا کہ میں ان کی پیاس بجھاؤں۔ فرات کہہ رہی تھی کہ میں نے حسین کے مقدس گھرانے کی بیبیوں کے چہرے تو نہیں دیکھے لیکن یہی خوش کیا کم تھی کہ میرا

پانی خیام حسینی تک پہنچا۔ پھر فرات کی ہر لہر رونے لگی اور کہنے لگی ہائے سات محرم ۔۔۔ جب میں نجس فوجوں کے محاصرہ میں گھر گئی۔ فرات کے نوحوں میں اضافہ ہوتا گیا میرے آنسو فرات کی لہروں میں شامل ہونے لگے۔ ایسا لگا کہ اب فرات کی سسکیاں بندھ گئی ہیں اور وہ اپنی بات کہنے سے معذور ہو گئی ہے۔ عاشور کی صبح خیام حسینی سے العطش کی آوازیں شائد اس کو پھر سنائی دینے لگیں کر فرات کا گلا بھر آیا تھا۔ شائد حسین کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھ میں خالی کوزے اس کی لہروں میں عکس بن کر ابھرنے لگے تھے۔ فرات نے پھر اپنے جذبات پر قابو پایا اور کہنا شروع کیا۔۔۔ ہائے مجھ بدنصیب کی مجبوری کہ یزید کی فوج کے گھوڑے، اونٹ، خچر اور نجس سپاہی اپنی پیاس بجھاتے رہے اور میرے حسین کے بچوں تک ایک قطرہ نہ پہنچا؟ فرات بولی میں نے دیکھا ہے وہ منظر جب تیروں نے شب کے پردے کو ہٹا کر صبح عاشور کی رونمائی کی۔ میں نے دیکھا ہے چاند جیسے چہروں کو مکر وفریب کے سیاہ اندھیروں میں گھرا ہوا۔ میں نے دیکھا ہے گلستان رسالت کے پھولوں کو لہو کے دریا میں غرق ہوتے۔۔۔

ہاں اس ہنگامے میں ایک بار ایسا بھی ہوا کہ میرا مقدر سنور گیا میرا مولا میرا آقا میرا عباس اچانک ٹھیک میرے سامنے کھڑا تھا اور پھر جب اس کا اسپ وفادار میرے نزدیک آیا تو میری لہروں نے دوڑ کر اس کے قدموں کو چوما۔ اللہ کا کرم دیکھو کہ ایک پیاسے کی دست بوسی کا شرف بھی ملا اور جب اس شیر نے ایک خشک مشک میری لہروں کے حوالے کی تو میرا قطرہ قطرہ اس میں سمانے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسی چھوٹی سی مشک میں میرا مولا اپنے کاندھوں پر مجھے اٹھا کر لے گیا لیکن پھر حسینی لشکر سے کوئی نہیں آیا۔ ہاں میں نے حسین کی گود میں ایک ننھا سا سورج ضرور دیکھا تھا جس نے اپنے خشک ہونٹوں پر جب زبان پھیری تو میرا کلیجہ منھ کو آ گیا لیکن وہ خورشید بھی اپنے خون کی سرخ شفق چھوڑ کر کربلا کی گرم ریت میں کھو گیا۔ ہاں میں نے حسین کو لڑتے دیکھا ہے لیکن انھوں نے ایک بار بھی ترائی کا رخ نہیں کیا میں

حسین کا چہرہ دیکھنے کو ترس گئی لیکن وہ تشنہ لب ایک بار بھی میری طرف نہیں آیا شائد وہ اس جگہ پر نظر نہیں کرنا چاہتے تھے جہاں عباس کے جسم کو پارہ پارہ کردیا گیا۔ جب بھی علی کا شیر جھپٹا تو تیراندازوں کی طرف جھپٹا جہاں حرملہ چھپ کر بیٹھا تھا۔ میرے مولا کا بدن تیروں سے چھلنی ہو گیا اور وہ کربلا کی گرم خاک پر تشریف لائے۔ جب میں حسین کا چہرہ دیکھنے کے قابل ہوئی تو حسین کا سر نوک نیزہ پر بلند ہو چکا تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں کتنی دیر فرات کے کنارے کھڑا رہا۔ فرات سے گفتگو کرنے کے بعد میں بھاری بھاری قدموں سے واپس لوٹنے لگا راستے میں ایک برقع پوش خاتون سڑک کے کنارے تبرکات بیچ رہی تھی اس سے کچھ تسبیحیں خریدیں۔ جب میں اس کو پیسے دے چکا تو اس نے کچھ اور تسبیحیں مجھے دیتے ہوئے کہا یہ میری طرف سے گفٹ ہے۔ اس تحفے سے بھی بڑا تحفہ اس خاتون نے ایک جملہ کی شکل میں دیا کہنے لگی ''امام حسین تمہاری زیارت قبول کریں'' میں اس قدر خوش ہوا کہ جس کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ کربلا آنا ہی اپنے آپ میں ایک سعادت ہے اور پھر کربلا میں کوئی یہ دعا دے کہ امام زیارت قبول کریں تو بڑا اچھا لگتا ہے۔

فرات سے لوٹ کر ایک بار پھر بازار کا رخ کیا حالانکہ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے لیکن دکانیں ابھی کھلی تھیں۔ میں نے اپنے لئے اور اپنی اہلیہ کے لئے کفن خریدا،، بچوں اور گھر کی خواتین کے لئے اسکارف خریدے پھر میں نے سوچا کہ کفن اور اسکارف وغیرہ ضریح سے مس کرلوں سب سے پہلے حضرت عباس کے روضے پر گیا لیکن وہاں روضے کی دھلائی کا کام چل رہا تھا اور زائرین کو ضریح کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی۔ روضے کے صحن میں زائرین کا ایک اژدھام تھا اور سب منتظر تھے کہ روضہ کھلتے ہی اندر جائیں گے۔ اسی بھیڑ میں میجر عدنان سے میری ملاقات ہوگئی وہ بھی روضے کئی فوجیوں کے ساتھ حاضری دینے آئے تھے۔ ان سے باتیں ہوتی رہیں انھوں نے کہا کہ وہ اپنا میڈیکل چیک اپ کروانے کے لئے انڈیا آنا چاہتے

ہیں۔

تقریباً دو گھنٹے تک ہم سب روضے کے اندر ہی اس انتظار میں کھڑے رہے کہ جلدی سی ضریح تک پہنچنے کا موقع ملے۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب خدام ضریح، اندرونی دیواروں اور زمین کو غسل دینے کے بعد وہاں سے گئے تو منظر دیکھنے والا تھا۔ زمین پر پڑے ہوئے پانی میں ہر شخص اپنی قمیض، اپنی چادر، اپنا دوشالہ الغرض جس کے پاس جو تھا اس کو تر کر رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں بچوں کے کچھ اسکارف اور کفن تھے میں نے جلدی جلدی ان کو اس پانی سے تر کیا جس سے روضے کو غسل دیا گیا تھا۔

اس کے بعد میں امام حسین کے روضے پر آیا اور کفن وغیرہ کو یہاں بھی مس کیا اور پھر ضریح کے قریب میں ہی بیٹھ گیا تاکہ نماز صبح کا وقت آجائے۔ اسی درمیان درگاہ شاہ مرداں دہلی کے امام جمعہ و جماعت مولانا طالب حسین زیدی صاحب سے ملاقات ہوئی اور شاعر کرار مولائی بھی روضے میں ہی نظر آئے۔ میں صبح کی نماز پڑھ کر واپس ہوٹل میں آگیا۔ تھوڑی ہی دیر سویا تھا کہ جناب رضا سرسوی صاحب پھر آگئے اور کافی وقت ان کے ساتھ گزرا۔ آج شعبان کی سولہ اور جولائی کی 29 تاریخ ہو چکی تھی اور کربلا سے روانگی میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا اس لئے میں ایک لمحہ بھی سو کر بتانا نہیں چاہتا تھا۔ دن بھر کربلا کی گلیوں میں گھومتا رہا اور دن کا کافی حصہ بچوں اور عزیزوں کے لئے تحائف خریدنے میں ہی گزرا۔

آج شب جمعہ تھی اس لئے امام حسین کے روضے پر پھر سے ایک خلقت امڈ آئی تھی۔ کہیں نماز پڑھنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہم لوگوں کو امام حسین کے حرم کی مینجمنٹ کمیٹی نے اپنے دفتر میں مدعو کیا تھا تاکہ ہم کو کچھ تحائف دئے جائیں۔ ہم لوگ حرم میں کہیں نماز پڑھنے کی جگہ نہ پا سکے اس لئے مجبوراً حرم امام حسین میں جو وی آئی پی روم تشریفات کے نام سے ہے وہیں ہم سب نے نماز ادا کی۔ اس کے بعد سعدالدین ہاشم صاحب نے ہم لوگوں کو اپنے دفتر میں بلایا اور کچھ

طغرے اور یادگاری شیلڈ عطا کیں۔ انھوں نے ہم لوگوں کو ہوائی جہاز کا کرایہ دینے کے لئے ہم سے جہاز کے ٹکٹ طلب کئے لیکن ہم سب پہلے ہی طئے کر چکے تھے کہ ہم لوگ حرم کی کمیٹی سے کرایہ نہیں لیں گے۔ ظاہر ہے دنیا کا ہر شیعہ یہ چاہتا ہے کہ وہ امام حسین کے روضے پر اپنی طرف سے کچھ نذرانہ پیش کرے اور ہم الٹے وہاں سے کرایہ لے لیں؟ ہمارے ضمیر نے اس کی اجازت نہیں دی۔ سعد الدین ہاشم نے بہت اصرار کیا لیکن ہم میں سے کوئی بھی کرائے کا چیک لینے پر راضی نہیں ہوا۔ اس کے بعد ہم لوگوں کی امام کے روضے پر پھر سے دعوت ہوئی اور سعد الدین ہاشم صاحب نے ضیوف میں ہم لوگوں کے کھانے کا اہتمام کیا۔ جانے کا وقت جیسے جیسے کم ہو رہا تھا کربلا سے چلے جانے کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ پچھلے 36 گھنٹوں میں مشکل سے صرف دو تین گھنٹے سویا تھا اور چوں کہ آج آخری رات تھی تو سونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے ساری رات میں ایک روضے سے دوسرے روضے تک آتا جاتا رہا۔ ڈھائی بجے رات کو خیمہ گاہ کی زیارت کی پھر زینبی ٹیلے کی زیارت کی۔ اس کے بعد حضرت عباس کے روضے پر آکر بیٹھ گیا وہیں نماز صبح، نماز زیارت اور نماز وداع پڑھ کر امام حسین کے روضے پر آ گیا یہاں دعائے ندبہ ہو رہی تھی اس میں شرکت کی اور بعد میں نماز زیارت اور نماز وداع ادا کی۔ ضریح کو آخری بوسہ دیتے وقت یہی دعا کی کہ مولا کربلا کا میرا یہ سفر آخری نہ ہو۔ دوبارہ بھی اپنے دربار میں حاضر ہونے کی سعادت مجھے عطا کیجئے گا۔

تھوڑی دیر بعد کربلا سے میں نجف کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس بار مجھے امیر المومنین کے روضے پر نہیں سیدھے ہوائی اڈے پر پہنچنا تھا۔ نجف کے ہوائی اڈے تک میں ایک ٹیکسی کر کے آیا تھا مسٹر طلال کا بیٹا ابراہیم مجھے چھوڑنے کے لئے آیا تھا لیکن ہوائی اڈے کے حفاظتی انتظامات کے تحت اب کوئی بھی ٹیکسی ہوائی اڈے میں داخل نہیں ہو سکتی۔ ہوائی ادے سے دو کلومیٹر پہلے ہی ایک سیکورٹی چیک پر سارا سامان اتار لیا جاتا ہے اور پھر ائیر پورٹ کی

مخصوص ٹیکسی کے ذریعہ ہی آپ ہوائی اڈے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ہوائی اڈے تک کے اس سفر کے لئے دس ڈالر ادا کرنا پڑتے ہیں۔ آغا سلطان اور ان کی فیملی کا ٹکٹ میرے ایک دن بعد کا تھا اس لئے میں ائیر پورٹ پر اکیلا ہی تھا۔ جب میں ائیر پورٹ پر پہنچا تو یہاں کا عالم عجیب تھا۔ سینکڑوں لوگ پہلے سے موجود تھے۔ ایک ہندوستانی نوجوان نے بتایا کہ وہ تین دن سے ائیر پورٹ پر بیٹھا ہے کیوں کہ سارے نجف پر غبار کی ایک دبیز چادر سی چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہوائی جہازوں کی آمد و رفت بند ہو گئی ہے۔ میں پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اگر آج بھی جہاز نہیں گیا تو مجھے بھی رات ائیر پورٹ پر کاٹنا پڑے گی میں نے مولا علی سے دعا کی کہ جلد یہ غبار چھٹ جائے اور ہوائی جہازوں کی آمد و رفت شروع ہو جائے اللہ کا شکر ہے کہ تھوڑی ہی دیر بعد یہ خبر آئی کہ چیک ان کی کارروائی شروع ہو رہی ہے۔ میری جان میں جان آئی گو کہ جہاز تین گھنٹے لیٹ تھا۔ نجف سے ایک بار پھر میرا جہاز صلوات کے نعروں کے درمیان بلند ہوا اور ہم بحرین ہوتے ہوئے ہند پہنچ گئے۔